ایک علمی و تحقیقی کاوش

چند احادیث پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات



حضرت مولانا مفتی نہال اختر قاسمی صاحب

فاضل دار العلوم دیوبند ۔ انڈیا

ادارۃ المعارف کراچی

ایک علمی و تحقیقی کاوِش

چند احادیث پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات

حضرت مولانا مفتی نہال اختر قاسمی صاحب

فاضل دارالعلوم دیوبند، انڈیا



اِدارۃُ المعارف کراچی

باہتمام : محمد مشتاق تنی

طبع جدید : محرم ۱۴۳۵ھ - نومبر ۲۰۱۳ء

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

ملنے کے پتے:

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی

فون: 021-35032020, 021-35123161

موبائل: 0300 - 2831960

ای میل: imaarif@live.com

* مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
* دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی
* ادارہ اسلامیات، انارکلی، لاہور
* بیت الکتب، گلشن اقبال، کراچی
* مکتبۃ القرآن، بنوری ٹاؤن، کراچی

یہ مقالہ

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں

دور حاضر کے ممتاز فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

کی نگرانی میں تیار کیا گیا

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر

انتساب

میں اپنی اس حقیر سی کاوش کو منسوب کرتا ہوں

اپنے والدین کے نام

جنہوں نے میری تعلیم و تربیت کا انتظام کیا

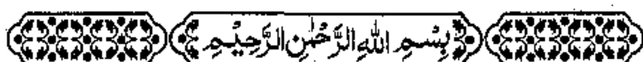
اور

اپنے اساتذۂ کرام کے نام

جنہوں نے زبان کھولنے اور قلم پکڑنے کا سلیقہ سکھایا

یہ مقالہ

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں
دورحاضر کے ممتاز فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم
کی نگرانی میں تیار کیا گیا



تقدیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَحَمَلَۃِ سُنَّتِہٖ وَالْمُدَافِعِینَ اِلٰی یَومِ الدِّینِ۔ اَمَّا بَعدُ!

انتہائی خوشی و مسرت کی بات ہے کہ اللہ پاک کے فضل و کرم سے احقر کی حقیر سی کوشش ''ایک علمی و تحقیق کاوش'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اس موقع پر راقم کا انگ انگ خوشی اور مسرت کے جذبات سے معمور ہے، احقر سب سے پہلے اللہ جل جلالہ عم نوالہ کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اسی پاک پروردگار نے اس کام کی توفیق مرحمت فرمائی اور مجھ حقیر فقیر سراپا تقصیر کے ذریعے اس عظیم الشان کام کی تکمیل کروائی، ورنہ راقم الحروف میں اس کی کوئی اہلیت اور لیاقت نہیں تھی۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی

منت شناس ازو کہ خدمت بداشتنت

بادشاہ پر احسان نہ دھرو کہ تم اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہو، اس کا احسان مانو کہ اس نے تمھیں اپنی خدمت میں قبول فرمالیا ہے۔

اس کتاب میں مرکزی طور پر مستشرقین کے ان سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں جو انہوں نے مختلف احادیث پر کیئے ہیں۔

احادیث پر اعتراض کرنے کا ایک مقصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت کو مسلمانوں کے دلوں سے نکالنا ہے، حالانکہ اللہ پاک نے اس امت کے دل میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام خاص طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ محبت ڈال دی ہے، اس کے لئے سر کٹا دینا، اپنی رگ جان کا آخری قطرہ خون بہا دینا، اس راہ میں جان و مال کا

نذرانہ پیش کر دینا نہ صرف آسان ہے بلکہ ہر مسلمان اسے ایک سعادت سمجھتا ہے اس سے اس کی زندگی کا سودا کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں خریدی جاسکتی، وہ اپنی رسوائی اور بے آبروئی کو برداشت کرسکتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ادنی بے توقیری کو گوارا نہیں کرسکتا، اس کے گھر کو آگ لگائی جاسکتی ہے مگر اس کے سینے میں جلنے والی محبت کی انگیٹھی نہیں بجھائی جاسکتی، یہی محبت وعظمت اس کی سب سے بڑی پونجی اور سب سے بڑی دولت ہے۔

یہ محبت جو اسے بزرگوں سے ایک درنایاب کی طرح حاصل ہوئی ہے کسی بھی قیمت پر وہ اس سے دست بردار نہیں ہوسکتا، کیونکہ اگر خدانخواستہ کسی شخص کے دل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وبزرگی کا احساس نکل جائے تو پھر اس کے ایمان کو اغوا کر لینا چنداں دشوار نہیں ہوگا۔ اس لیے میں اپنے تمام دینی بہن بھائیوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی دسیسہ کاریوں اور عالمی سازشوں سے متنبہ رہیں اور پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی جو محبت وعظمت ہمیں اپنے اسلاف سے ملی ہے اور جس پر ہم سب کا مسلمان ہونا موقوف ہے اس امانت میں ذرا بھی کمی نہ آنے دیں، اور اسے اگلی نسلوں تک پہنچانے کی بھرپور جدوجہد کریں۔

احادیث نبویہ پر اعتراض کرنے کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ امتِ محمدیہ (علی صاحبها الف الف تحية) کا احادیث پر اعتماد نہ رہے، امت کے دلوں میں احادیث کی اہمیت کم ہوجائے حالانکہ جس طرح امت کے ہاتھوں کلامِ خداوندی کی حفاظت من جانب اللہ کرائی گئی ہے بعینہٖ حدیث کی حفاظت کے لیے بھی حق جل مجدہ نے امت مرحومہ کو موفق فرمایا ہے اور اس امت نے جس طرح تحفظ کتاب میں حیرت انگیز سعی کی ہے اس سے کہیں زیادہ سنت کی حفاظت میں سرگرمی کا حق ادا کیا ہے اور وہ کچھ کر دکھایا ہے جو دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی کسی سماوی کتاب کے ساتھ بھی نہیں کرسکی۔

اس بات کا اعتراف بعض مستشرقین نے بھی کیا ہے۔

مشہور جرمن ڈاکٹر اسپرنگر اپنی کتاب Life of Mohammad میں لکھتا ہے:

''کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ موجود ہے کہ جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو۔ جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے''۔

اپالوجی فار محمد کے مصنف گارڈ فری ہیگن کی عبارت ملاحظہ ہو:

''اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام مقنین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے وقائع عمری محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں''۔

ہٹی ایک فرانسیسی مصنف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھتا ہے:

"He was born in the full light of history"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کی پوری روشنی کے اندر دنیا میں تشریف لائے۔

آپ نے بیس سال پہلے ایک کتاب ''The Hundred'' کا نام سنا ہوگا، وہ کتاب مائیکل ہارٹ نے لکھی ہے وہ عیسائی ہے، اس نے اپنے زعم میں تاریخ میں سے سو ایسی شخصیات کا انتخاب کیا جنھوں نے تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے، لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان سو ہستیوں میں اس نے سب سے پہلے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک تذکرہ کیا، اور تذکرہ کرتے ہوئے اس نے ایک فقرہ لکھا:

"My choice of Mohammad to lead the ranking of the most influetcial personalities the history will surprise some of the reader."

میں نے سو آدمیوں کا تذکرہ کیا جنہوں نے دنیا کو سب سے زیادہ متاثر کیا، ان میں سب سے پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تذکرہ کیا ہے، اس سے بعض لوگ حیران ہوں گے لیکن اس کی میرے پاس ایک مضبوط دلیل ہے، کہ کائنات میں جتنی بھی ہستیاں آئیں ہم اگر ان کے حالات پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں اپنے وقت کے بہترین تعلیمی اداروں میں ہم ایک طالبعلم بن کر جاتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن دنیا میں فقط ایک ہستی ایسی نظر آتی ہے کہ وہ پوری زندگی کسی کے سامنے شاگرد بن کر بیٹھی نظر نہیں آتی۔ وہ ہستی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، یہ وہ ہستی ہیں جنہوں نے دنیا سے علم نہیں پایا بلکہ دنیا کو ایسا علم دیا کہ اس جیسا علم نہ پہلے کسی نے دیا اور نہ بعد میں کوئی دے گا۔

اس لیے میں نے ان کے تذکرہ کو اولیت اور فوقیت دی۔

گبن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے زمانے کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

At that time Arabia was the most degraded nation of the world.

یعنی ''اس وقت عرب کے لوگ دنیا کی ذلیل ترین قوم تھے''۔ لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو اسی رائٹر کو یہ لکھنا پڑا کہ:

The land of Arabia became the nursary of the heroes.

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عرب کی سرزمیں ہیروز کی نرسری بن گئی۔

کہتے ہیں ''فضل وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دے''

اس قسم کی دسیوں عبارتیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن طوالت کے خوف کی وجہ سے

انہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ ایسی "Documen led life" (تاریخی زندگی) آج تک کائنات میں کسی نے نہیں گذاری، یہ صرف اور صرف ہمارے پیغمبر کی مبارک ذات ہے، لاکھوں احادیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی نہ کسی گوشے پر روشنی ڈالتی نظر آتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات آج بھی محفوظ ہیں اور قیامت تک محفوظ رہیں گی۔

ان حقائق اور شواہد کے باوجود معترضین ومنکرین نے اعتراضات کیے ہیں، بہت ساری حدیثوں کے متعلق شکوک وشبہات پیش کیے ہیں، رکیک قسم کی تاویلات کی ہیں۔ اس لیے علماء امت یعنی اسلام کے وکیلوں نے اپنے اپنے اعتبار سے ان شبھات کے جوابات دیئے ہیں۔

اسی پس منظر میں راقم الحروف نے بھی ان شکوک کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ قارئین جہاں کہیں کوئی سقم پائیں تو راقم کو ضرور مطلع کریں ان شاء اللہ یہ عاجز بسر وچشم قبول کرے گا۔ اور آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کر دے گا، اس کتاب کی ترتیب میں جہاں کہیں دماغ اور قلم نے صحیح کام کیا ہے وہ اللہ پاک کی توفیق اور اساتذۂ کرام سے استفادے کا ثمرہ ہے، اور جہاں کہیں قلم نے ٹھوکر کھائی ہے وہ اپنے قصور اور تہی دامنی کا نتیجہ ہے جس کے لیے خدا کے سامنے عفوودرگذر کا ملتجی ہوں۔ اور بندگان خدا سے خیر خواہی کا طالب ہوں۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا

محمد نہال اختر

۱۶/ ۲/ ۲۰۱۳ء

واقعہٴ عہد الست

واقعۂ عہد الست

قَالُوْا: رَوَيْتُمْ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى مَسَحَ عَلٰى ظَهْرِ آدَمَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَاَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّتَهُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، اَمْثَالَ الذَّرِّ، وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰى![1]

معترضین نے کہا کہ تمہاری روایت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا دست قدرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کی پشت پر پھیرا اور اس سے چیونٹیوں کی شکل میں ان کی تمام ذرّیتؒ کو نکالا جو قیامت تک آنے والی تھی اور ان سے ان کی جانوں پر اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: کیوں نہیں؟ واقعی آپ ہمارے رب ہیں۔

یہ روایت بظاہر متعارض ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے قول ''وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ الخ''[2] کے یعنی اور جب تمہارے پروردگار نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا تھا، اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا (اور پوچھا تھا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ کیوں نہیں ہم سب اس کی گواہی دیتے ہیں۔

اعتراض: مذکورہ روایت پر اعتراض یہ ہے کہ حدیثِ رسول بظاہر آیتِ قرآنی

---

(۱) رواه ابوداؤد: رقم الحديث: ۴۷۰۳، والترمذي: كتاب التفسير رقم: ۳۰۷۶ وقال ابوعيسى: هذا حديث حسن بلفظ: ان الله عزوجل خلق آدم ثم مسح على ظهره بيمينه فاستخرج منه ......۔

(۲) سورة الاعراف: ۱۷۲

کے خلاف ہے، کیونکہ حدیث میں تو ذریت کو آدم علیہ الصلوۃ والسلام کی پشت سے لینے اور نکالنے کا ذکر ہے، جبکہ قرآن کریم میں بنی آدم یعنی اولاد آدم کی پشت سے نکالنا مذکور ہے، اسی مضمون کی ایک اور روایت ابو داؤد میں ہے، حضرت مسلم بن یسار روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اس آیت شریفہ کا مطلب پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تھا، آپ سے جو جواب میں نے سنا ہے وہ یہ کہ:

''اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم کو پیدا فرمایا، پھر اپنا دست قدرت ان کی پشت پر پھیرا تو ان کی پشت سے جو نیک انسان پیدا ہونے والے تھے وہ نکل آئے، تو فرمایا کہ ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ جنت ہی کے کام کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ان کی پشت پر دستِ قدرت پھیرا تو جتنے گناہ گار بدکردار انسان ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے ان کو نکال کر کھڑا کیا اور فرمایا: کہ ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے، اور یہ دوزخ میں جانے کے کام کریں گے؛......[1]

یہ روایت بہت ہی تفصیل کے ساتھ ترمذی، ابو داؤد، اور موطا امام مالک میں مذکور ہے، اسی طریقہ سے اسی مضمون کی اور بھی روایات ہیں جو مسند احمد میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ ان احادیث میں تو ذریت کو آدم کی پشت سے لینے کا اور نکالنے کا ذکر ہے، جبکہ آیت میں بنی آدم یعنی اولاد آدم کی پشت سے نکالنا مذکور ہے، لہٰذا روایت بظاہر آیت کے خلاف ہے:

لِاَنَّ الْحَدِيْثَ يُخْبِرُ اَنَّهُ اَخَذَ مِنْ ظَهْرِ آدَمَ، وَالْكِتَابُ يُخْبِرُ اَنَّهُ اَخَذَ مِنْ ظُهُوْرِ بَنِيْ آدَمَ، فَكَيْفَ التَّوْفِيْقُ؟

---

(۱) رواه ابو داؤد، کتاب السنة، باب فی القدر ۲/۶۴۴

جواب: حقیقت میں آیت واحادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، بلکہ دونوں کے معانی درست اور صحیح ہیں، اس لئے کہ کتاب اللہ میں احکام کو اجمالاً بیان کیا جاتا ہے، حدیث اسی کی تفصیل اور تشریح کرتی ہے، اجمال وتفصیل کا یہ فرق اگر معترض کے پیشِ نظر ہوتا تو شاید یہ اشکال ہی پیدا نہ ہوتا، اصل واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر اپنا دست قدرت پھیرا، پھر اس سے ان کی اس تمام ذریت کو نکالا جو ان سے بلاواسطہ پیدا ہونے والی تھی، پھر ان کی نسل کی پُشت سے دوسروں کو، اور اسی طرح جس ترتیب سے اس دنیا میں اولادِ آدم پیدا ہونے والی تھی اسی ترتیب سے اُن کو اِن کی پُشتوں سے نکالا، جب حدیث شریف میں سب کو حضرت آدم کی پُشت سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمؑ سے ان کی اولاد کو پھر اس اولاد سے ان کی اولاد کو ترتیب وار پیدا کیا گیا، تو جب اس اولاد سے اللہ نے اخذ ومیثاق لیا تو گویا کہ بنی آدم علیہ السلام سے ہی لیا، لہٰذا قرآن میں جو "اَخَذَ مِنْ ظُهُوْرِ بَنِیْ آدَمَ" ہے وہ بالکل صحیح ہے، اس میں اور حدیثِ رسول میں کوئی تعارض نہیں، علامہ قتیبہ اس اعتراض کا جواب لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَلَا تَرٰی اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی حِیْنَ مَسَحَ ظَھْرَ آدَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ، عَلٰی مَا جَاءَ فِی الْحَدِیْثِ فَاَخْرَجَ مِنْہُ ذُرِّیَّتَہٗ اَمْثَالَ الذَّرِّ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ اِنَّ فِیْ تِلْکَ الذُّرِّیَّۃِ، اَلْاَبْنَاءُ، وَاَبْنَاءُ الْاَبْنَاءِ وَاَبْنَائُھُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ فَاِذَا اَخَذَ مِنْ جَمِیْعِ اُولٰئِکَ الْعَھْدَ وَاَشْھَدَ ھُمْ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ۔ فَقَدْ اَخَذَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ جَمِیْعًا، مِنْ ظُھُوْرِھِمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ۔ (۱)

اس قسم کی تعبیر قرآن پاک میں متعدد بار آئی ہے، مثلاً قرآن میں ہے "وَلَقَدْ

(۱) تاویل مختلف الحدیث ص۔ ۹۷

خَلَقْنَاکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاکُمْ......" یہاں مراد ہے کہ ہم نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، اور آدم علیہ السلام کی تصویر بنائی، آیت میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، جبکہ اس وقت اولادآدم کا وجود بھی نہ تھا، تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس وقت اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ہمیں بھی ان کی صلب میں پیدا کر دیا تھا، اس لیے آدم علیہ السلام کی تخلیق کو ہماری تخلیق قرار دیا۔ ادب عربی میں بھی اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً کوئی آدمی کسی شخص کو ایک بکرا اور ایک بکری ہبہ کرتا ہے، مگر وہ کہتا ہے کہ میں نے بہت ساری بکریاں ہبہ کیں۔ مطلب یہ کہ یہ دونوں بہت سارے بکرے بکریوں کا ذریعہ ہوں گے اور اس سے کافی افزائش ہوگی، اسی سے ملتی جلتی ایک مثال ابن قتیبہ نے بیان کی ہے:

" وَکَانَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ وَهَبَ لِدُکَیْنِ الرَّاجِزِ اَلْفَ دِرْهَمٍ۔ فَاشْتَرٰی بِهٖ دُکَیْنٌ عِدَّةً مِنَ الْاِبِلِ، فَرَمَی اللّٰهُ تَعَالٰی فِی اَذْنَابِهَا بِالْبَرْکَةِ، فَنَمَتْ وَکَثُرَتْ، فَکَانَ دُکَیْنٌ یَقُوْلُ: هٰذَا مَنَائِحُ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ وَلَمْ تَکُنْ کُلُّهَا عَطَائُهٗ، وَاِنَّمَا اَعْطَاهُ الْآبَاءَ وَالْاُمَّهَاتِ، فَنَسَبَهَا اِلَیْهِ، اِذْ کَانَتْ نَتَائِجُ مَا وُهِبَ لَهٗ۔(تاویل مختلف الحدیث: ص ٦٠)

اس قسم کے استعمالات اور بھی ہیں، جن سے یہ بات آئینہ کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ آیت و حدیث کے مابین کوئی حقیقی اختلاف نہیں، بلکہ یہ اعتراض برائے اعتراض ہے۔ یا معترض کی کم علمی کی دلیل ہے۔

واقعۂ رجم

قَالُوْا: رَوَيْتُمْ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجَمَ وَرَجَمَتِ الْاَئِمَّةُ بَعْدَهُ، وَاللّٰهُ تَعَالٰى يَقُوْلُ: "فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ"(۱)
وَالرَّجْمُ اِتْلَافُ النَّفْسِ لَا يَتَبَعَّضُ، فَكَيْفَ يَكُوْنُ عَلَى الْاِمَاءِ نِصْفُهُ؟ وَذَهَبُوْا اِلٰى اَنَّ الْمُحْصَنٰتِ: ذَوَاتُ الْاَزْوَاجِ فَقَالُوْا: وَفِيْ هٰذَا دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْمُحْصَنَةَ حَدُّهَا الْجَلْدُ۔(۲)

ترجمہ: معترضین نے کہا کہ تمہاری روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم (سنگسار) کیا۔ اس کے بعد ائمہ نے سنگسار کیا، اور اللہ تعالیٰ نے باندیوں کی حد کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ ''اگر وہ (باندیاں) زنا کا ارتکاب کر بیٹھیں تو ان کو اس سزا سے آدھی سزا ملے گی جو آزاد عورتوں کے لئے مقرر ہے''۔

اور رجم اتلاف نفس کا نام ہے، نیز اس میں بعضیت اور تجزّی ناممکن ہے، تو پھر باندیوں کے لئے نصف رجم کی سزا کیوں کر مقرر ہو سکتی ہے، اور معترضین نے محصنٰت سے ذوات الازواج، شادی شدہ آزاد عورتوں کو مراد لیا ہے، اور انہوں نے کہا کہ یہ دلیل ہے اس بات پر کہ محصنہ کی حد جلد ہے۔

اعتراض: اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ حد سے متعلق چند احکام ہیں جن پر امت

---

(۱) معارف القرآن ۲/ ۳۷۳۔ (۲) تاویل مختلف الحدیث ص: ۲۲۶

کا اتفاق ہے، لیکن قرآن کریم کی آیت اسے بظاہر باطل قرار دے رہی ہے، جیسا کہ معترضین نے کہا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگسار کرنے کا حکم فرمایا، اس کے بعد ائمہ نے اس حکم کو جاری کروایا، اور اللہ پاک باندیوں کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ''اگر یہ باندیاں زنا کر بیٹھیں تو انہیں اس سزا سے آدھی سزا دی جائے گی جو آزاد عورتوں کے لئے مقرر ہے''۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیت میں باندی کی سزا کے بارے میں کہا گیا کہ محصنٰت کو جو سزا ملتی ہے اس کی آدھی سزا باندی کو ملے گی، اور محصنت سے مراد آزاد عورت شادی شدہ ہے، اور یہ بات محقق ہے کہ آزاد شادی شدہ عورت اگر زنا کا ارتکاب کرے تو اُسے سنگسار کرنے کا حکم ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ رجم اتلاف نفس کا نام ہے جس میں تجزی اور بعضیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تو پھر باندی کو نصف سزا کیسے دی جائے گی، فَكَيْفَ يَكُوْنُ عَلَى الْاِمَاءِ نِصْفُهُ؟ نیز آیت دلیل ہے اس بات پر کہ محصنہ کی حد جلد ہے نہ کہ رجم؟ اور یہ فقہاء وائمہ کے عمل کے خلاف ہے۔

جواب: جواب نہایت ہی آسان ہے، کہ یہاں محصنٰت سے مراد غیر شادی شدہ آزاد عورتیں ہیں۔ غیر شادی شدہ آزاد مرد وعورت سے اگر زنا ہو جائے تو اس کو سو سو کوڑے لگائے جائیں گے، جس کا مفصل ذکر سورۂ نور کی دوسری آیت میں موجود ہے کہ، اور جو کوئی غیر شادی شدہ مرد وعورت زنا کرے تو اس کی سزا سو کوڑے ہے۔

اور چونکہ رجم میں تنصیف نہیں ہوسکتی، اس لئے ائمہ کرام کا مذہب یہی ہے کہ غلام یا باندی خواہ شادی شدہ ہوں، یا کنوارے ہوں اگر ان سے زنا سرزد ہو جائے تو ان کی سزا پچاس کوڑے ہیں، باندیوں کا حکم تو آیت شریفہ میں مذکور ہے، لیکن بطور دلالۃ النص غلام کا مسئلہ بھی اسی سے سمجھ میں آرہا ہے، اصل میں معترض نے محصنٰت

کے معنی ذوات الازواج لیا، اس لیے اسے پریشانی ہوئی اور سوال پیدا ہوگیا کہ رجم میں تنصیف نہیں ہوگی تو پھر باندیوں کو نصف عذاب دینے کا کیا مطلب ہوگا؟ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ آیت میں محصنت سے مراد غیر شادی شدہ آزاد عورتیں ہیں، لہٰذا نہ تو تنصیف رجم کا سوال پیدا ہوگا اور نہ ہی یہ حکم آیت کے خلاف ہے، کہ جس کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔[1]

---

[1] معارف القرآن ۲/۳۷۳، تاویل مختلف الحدیث ص: ۶۲۲

نیک کاموں سے عمر بڑھتی ہے

قَالُوْا: رَوَيْتُمْ: عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ: صِلَةُ الرَّحْمِ تَزِيْدُ فِي الْعُمُرِ[1]

وَاللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ: "فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ"۔[2]

قَالُوْا: فَكَيْفَ تَزِيْدُ صِلَةُ الرَّحْمِ فِي اَجَلٍ لَا يَتَاَخَّرُ عَنْهُ وَلَا يَتَقَدَّمُ؟[3]

ترجمہ: معترضین نے کہا کہ تمہاری روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صلہ رحمی سے عمر میں زیادتی ہوتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ عمر میں زیادتی کیسے ہوسکتی ہے جبکہ کوئی شخص اجل معیّن سے نہ آگے ہوسکتا ہے نہ اس سے پہلے، یعنی تقدیم وتاخیر کا سوال ہی نہیں ہوتا۔

اعتراض: اشکال بہت ہی واضح ہے کہ حدیث پاک میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صلہ رحمی کرنے سے عمر میں اضافہ ہوجاتا ہے، جبکہ قرآن کی آیت

---

(۱) اخرجه الترمذی، ابواب القدر، باب ماجاء لا یرد القدر الا الدعاء عن سلمان مرفوعا، بلفظ لا یرد القضاء الا الدعا ولا یزید فی العمر الا البر، رقم الحدیث: ۲۱۳۹

وابن ماجة، فی المقدمة، باب فی القدر، رقم الحدیث: ۹

واحمد فی مسنده، ۲/۳۱۶-۳۵- ۲/۲۳،۳۵

(۲) سورة النمل: ۶۱ (۳) تاویل مختلف الحدیث ص ۲۳۸- والترمذی ۲/۱۹- باب ماجاء فی تعلم النسب

کہہ رہی ہے کہ جب موت کا وقت آجائے گا تو وہ ایک ساعت آگے ہوسکتا ہے نہ ایک ساعت پیچھے۔

"فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ" بلکہ متعین وقت میں ہی انسان کی روح پرواز کر جائیگی، پھر آپ نے کیسے فرمایا کہ صلہ رحمی کرنے سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے، یہ حدیث بظاہر آیتِ قرآنی کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

جواب: ① صلہ رحمی سے عمر میں زیادتی ہوتی ہے یا صلہ رحمی عمر میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل عمر تو متعین ہے، لیکن صلہ رحمی سے رزق میں وسعت اور زیادتی ہوتی ہے اور یہ صلہ رحمی خوشگوار زندگی، نیک کاموں کی توفیق میں اضافہ اور نورانیت قلب وجگر کا باعث ہوتی ہے، گویا اسی برکت کو زیادتی عمر سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

② درازئ عمر سے مراد یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد دنیا میں اس کا نیک نام باقی رہتا ہے۔

③ یا درازئ عمر سے اس کے مرنے کے بعد اس کی ذرّیت صالحہ مراد ہے جو اس کے لئے دعاءِ مغفرت اور ایصالِ ثواب کریں گے اور اپنی سیرت وکردار سے اپنے والد کے نام کو زندہ رکھیں گے، جیسا کہ ایک دوسری روایت میں ہے:

عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُ اَنَّهُ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ: "اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، اَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوْ لَهُ"۔(۱)

---

(۱) اخرجه مسلم: عن ابی هريرة رضی الله عنه كتاب الوحی، باب ما يلحق الانسان من الثواب بعد وفاته رقم الحديث: ۴۲۲۳

وابو داؤد عن ابی هريرة، كتاب الوصايا، باب ماجاء فی الصدقة عن الميت، رقم الحديث: ۲۸۸۰

والترمذی عنه، كتاب الاحكام، باب ماجاء فی الوقف، رقم الحديث: ۱۳۷۶

والنسائی: عنه، كتاب الوصايا، باب فضل الصدقة من الميت، رقم الحديث: ۳۶۸

احمد فی المسند، ۳۷۲/۲

روایت کا حاصل یہ ہے کہ جب انسان اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے تو سوائے تین چیزوں کے سارے اعمال کا سلسلہ اس سے منقطع ہوجاتا ہے، ۱: صدقہ جاریہ، ۲: علم نافع ۳: اولاد صالح یہی نیک اولاد مردے کے نیک نام کو زندہ رکھے گی، اور معنوی اعتبار سے یہی عمر میں زیادتی ہے۔

یا یہ زیادتی باعتبار نوشتۂ لوح محفوظ کے ہے، جیسا کہ روایت میں ہے کہ کسی کی عمر ساٹھ سال ہے لیکن اگر وہ صلہ رحمی کرنے لگے گا تو چالیس سال کا اضافہ کردیا جائے گا اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ صلہ رحمی کریگا تو مجموعۂ عمر ایک سو سال ہوگا، یہی نوشتۂ لوح محفوظ میں معین ہے، اس پر زیادتی نہیں ہوگی، اور یہ تشریح ہے اللہ کے قول، یَمحُو اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ" کی۔ (۱)

پہلی اور آخری توجیہ کی تائید علامہ قتیبہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اِنَّ الزِّیَادَةَ فِی الْعُمُرِ تَکُوْنُ بِمَعْنَیَیْنِ: اَحَدُھُمَا اَلسَّعَةُ وَالزِّیَادَةُ فِی الرِّزْقِ، وَعَافِیَةُ الْبَدَنِ، وَالآخَرُ اَنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ یَکْتُبُ اَجَلَ عَبْدِہٖ عِنْدَہٗ مِائَةَ سَنَةٍ، وَیَجْعَلُ بُنْیَتَہٗ وَتَرْکِیْبَہٗ وَھَیْئَتَہٗ لِتَعْمِیْرِ ثَمَانِیْنَ سَنَةً، فَاِذَا وَصَلَ رَحِمَہٗ، زَادَ اللّٰہُ تَعَالیٰ فِی ذٰلِکَ التَّرْکِیْبِ وَفِی تِلْکَ الْبُنْیَةِ، وَوَصَلَ ذٰلِکَ النَّقْصُ فَعَاشَ عِشْرِیْنَ اُخْرٰی حَتّٰی یَبْلُغَ الْمِائَةَ وَھِیَ الْاَجَلُ الَّذِیْ لَا یَسْتَاْخِرُ عَنْہُ وَلَا یَتَقَدَّمُ" (۲)

عمر میں زیادتی کے دو معنی ہیں، ایک معنی رزق میں زیادتی ووسعت اور آسائش وآرام ہیں، اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندے کی مدت حیات اپنے پاس

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح لملا علی قاریؒ، ۹/۱۹۵، ۵۱، اشعۃ اللمعات ۴/۱۰۹، تنظیم الاشتات ۳/۱۶۳

(۲) تاویل مختلف الحدیث

سوسال لکھتے ہیں اور اس کی حقیقت وترکیب میں اسی سال لکھتے ہیں، یعنی بیس سال کم کردیتے ہیں، لیکن جب وہ صلہ رحمی کرتا ہے تو وہ نقص ختم ہوجاتا ہے اور وہ مزید بیس سال زندہ رہتا ہے تاکہ وہ سوسال کی عمر کو پہنچ جائے، اور یہی وہ مدت ہے کہ نہ تو اس میں تقدیم ہوگی نہ تاخیر۔

صدقہ سے بلاٹل جاتی ہے

قَالُوْا: رَوَیْتُمْ: اِنَّ الصَّدَقَةَ تَدْفَعُ الْقَضَاءَ الْمُبْرَمَ، وَاللّٰهُ عَزَّوَ جَلَّ یَقُوْلُ: اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ (سورۃ النحل)

ترجمہ: مستشرقین کا اعتراض ہے کہ تمہاری روایت ہے کہ صدقہ قضاء مبرم کوٹال دیتا ہے، اور اللہ پاک فرماتا ہے، ہم جس چیز کو موجود کرنا چاہتے ہیں، اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا پس وہ فوراً ہو جاتی ہے۔(۱)

اعتراض: معترضین کا سوال یہ ہے کہ روایات میں ہے کہ صدقہ قضاء مبرم کوٹال دیتا ہے حالانکہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ جب ہم کسی چیز کو وجود بخشنا چاہتے ہیں تو ہم صرف کُن (ہو جا) کہتے ہیں تو وہ چیز وجود پذیر ہو جاتی ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ اللہ پاک کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا، کوئی اس میں تبدیلی نہیں کرسکتا، تو پھر یہ صدقہ اللہ پاک کے فیصلے کو کیسے ٹال دے گا؟

جواب: ۱۔ معترض کو جو اعتراض پیدا ہوا ہے اس کی بنیادی وجہ قضاء مبرم اور قضاء معلّق کے مابین فرق نہ کرنا ہے، اور ان دونوں کے معانی سے عدم واقفیت ہے، اگر وہ اس فرق کو جان لیتے تو یہ اعتراض پیدا نہ ہوتا، بہر حال اعتراض کا سب سے آسان اور صاف جواب یہ ہے کہ یہاں قضاء مبرم مراد نہیں ہے جو قطعی طور پر فیصل شدہ

(۱) ترجمہ تفسیر مظہری

امر ہوتا ہے، اور اس میں تغیر و تبدّل نہیں ہوتا، بلکہ قضاء معلّق مراد ہے، وہ قضا جو کسی چیز پر معلق ہوا کرتی ہے، یعنی ایک آدمی اپنے گناہوں کی وجہ سے عتاب کا مستحق ہوجاتا ہے بشرطیکہ دعا یا صدقہ نہ کرے، لیکن اگر وہ صدقہ ودعا کرے تو وہ بلا ٹل جائیگی، اور پریشانی ختم ہوجائیگی، جیسا کہ علامہ قتیبہ رقمطراز ہیں:

"وَنَحْنُ نَقُوْلُ فِيْ تَاوِيْلِ ذٰلِكَ: اِنَّ الْمَرْءَ قَدْ يَسْتَحِقُّ بِالذُّنُوْبِ قَضَاءً مِنَ الْعُقُوْبَةِ، فَاِذَا هُوَيَصَدَّقُ دَفَعَ عَنْ نَفْسِهِ مَا قَدْ اِسْتَحَقَّ" بِذٰلِكَ يَدُلُّ عَلَيْهِ: صَدَقَةُ السِّرِّ تُطْفِيُ غَضَبَ الرَّبِّ اَفَلَاتَرٰى اَنَّ مَنْ غَضَبَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ تَعَرَّضَ لِعِقَابِهِ، فَاِذَا اَزَالَ ذٰلِكَ الْغَضَبَ بِصَدَقَتِهِ اَزَالَ الْعِقَابَ۔ وَمِثْلُ هٰذَا رَجُلٌ اُجْرِمَ عَلَيْهِ جُرْمًا عَظِيْمًا، فَخَفَّتْ بَوَائِقُهُ وَعَاجَلَ جَزَائَهُ فَاُهْدِيَتْ لَهُ هَدِيَّةٌ كَفَّفَتْهُ بِهَا، وَيُقَالُ: الْهَدِيَّةُ تَدْفَعُ الْعِقَابَ الْمُسْتَحَقَّ (۱)

مطلب یہ ہے کہ خفیہ صدقہ اللہ پاک کے غصہ کو بجھا دیتا ہے، اسی کو مثال سے سمجھایا کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ ایک آدمی عتاب کا مستحق ہوجاتا ہے، لیکن جب وہ صدقہ کرتا ہے تو اللہ پاک اس عذاب اور عتاب کو اس سے ٹال دیتے ہیں، اسی کو سمجھانے کے لئے اور بات کو واضح کرنے کے لئے انہوں نے ایک انوکھی مثال بیان کی ہے، اَلْهَدِيَّةُ تَدْفَعُ الْعِقَابَ یعنی ایک آدمی کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، جس سے اس کا پڑوسی ناراض ہوجاتا ہے اور وہ بدلہ لینے کے درپے ہوجاتا ہے، اور سامنے والے کو سزا دینے کے لئے گھات میں بیٹھا رہتا ہے کہ اسی اثنا میں وہ مجرم شخص اپنے مظلوم پڑوسی کو ہدیہ دیتا ہے اور تحفے تحائف سے اس کے دل کو اتنا خوش کرتا ہے کہ وہ بدلہ لینا ہی

☆ تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبة ص ۹۳۲

بھول جاتا ہے، یا بالفاظ دیگر ہدیہ کی وجہ سے وہ سزا دینے سے دست بردار ہوجاتا ہے، اور صلح کر لیتا ہے، بعینہ اسی طرح سے صدقہ سے اللہ پاک قضاء معلق کو ٹال دیتا ہے۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ رد قضا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معاملہ قضاء کو اس طرح آسان کر دیتا ہے کہ گویا کہ قضاء نازل ہی نہیں ہوتی۔

۳۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ دفع بلا وعقاب میں جو صدقہ کی تأثیر ہے، اس میں مبالغہ کرنا مراد ہے، یعنی صدقہ کی تأثیر اس حد تک ہوسکتی ہے کہ اگر قضاء الٰہی کو رد کرنا ممکن ہوتا تو اس کو بھی یہ صدقہ رد کر دیتا۔ (۱)

اس کے علاوہ اور بھی اس کی توجیہات ہیں۔ لیکن مذکورہ توجیہات سے بات بالکل واضح ہوجاتی ہے، اس لئے ان ہی چند توجیہات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح، ۹/۱۹۵۔ التعلیق ۳/۴۸، ۴۹

وارث کے حق میں وصیّت نہیں

قَالُوْا: رَوَيْتُمْ: إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ(۱)

وَاللّٰهُ تَعَالٰى يَقُوْلُ: "كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ"(۲)

وَالْوَالِدَانِ وَارِثَانِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ، لَا يَحْجُبُهُمَا اَحَدٌ عَنِ الْمِيْرَاثِ وَهٰذِهِ الرِّوَايَةُ خِلَافُ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔

ترجمہ: معترضین نے کہا کہ تمہاری روایت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) اخرجه البخاری عن ابن عباس، (کتاب الوصایا، بلفظ لاوصیة لوارث، رقم الحدیث، ۲۷۴۷، ۸۷۵۴، ۹۳۷۶

وابوداؤد عن ابی امامة، (کتاب الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة لوارث، رقم الحدیث، ۲۸۷۰)

والترمذی عن عمرو بن خارجة، کتاب الوصایا، باب ماجاء ،لا وصیة لوارث، برقم ۲۱۲۱)

والنسائی عنه،(کتاب الوصایا، باب ابطال الوصیة للوارث، رقم الحدیث، ۳۶۴۱۔ ۳۶۴۲۔ ۳۶۴۳)

وابن ماجة عنه، (کتاب الوصایا، باب لا وصیة لوارث، رقم الحدیث۔ ۲۷۱۲۔ ۲۷۱۳۔ ۲۷۱۴)

والدارمی کتاب الوصایا، رقم الباب ۸۲ (۷) واحمد ۔(۴/۱۸۶۔ ۱۸۷ ۲۳۸)

(۲) سورة البقرة: ۱۸۰

نے ارشاد فرمایا کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے؟ جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کی موت نزدیک معلوم ہونے لگے (بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو،) تو والدین اور اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زائد نہ ہو) کچھ دیا جائے (اس کا نام وصیت ہے) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری ہے۔ (ترجمہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ)

تو سوال یہ ہے کہ والدین تو ہر حال میں وارث ہوتے ہیں کبھی میراث سے محروم ہوتے ہی نہیں جیسا کہ آیت سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے، لہٰذا حدیثِ رسول آیتِ قرآنی کے بظاہر خلاف معلوم ہوتی ہے؟

جواب: حقیقت میں حدیث وآیت کے مابین کوئی تعارض ہی نہیں کیونکہ آیت (اِذَاحَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ الخ) منسوخ ہے آیت میراث ''یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ'' کے ذریعہ:

كَمَا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ ''فَكَانَتِ الْوَصِيَّةُ كَذٰلِكَ حَتّٰى نَسَخَتْهَا الْمِيْرَاثُ'' رواه ابوداؤد

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ آیت مذکورہ کے ذیل میں فرماتے ہیں: ابتداءً رشتہ دار واقارب کے لئے وصیت کرنا فرض تھا، لیکن جب آیت میراث نازل ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا، عبارت ملاحظہ فرمایئے:

قَوْلُهٗ: ''فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ، كَانَتِ الْوَصِيَّةُ لِلْاَقَارِبِ فَرْضًا قَبْلَ نُزُوْلِ آيَةِ الْمِيْرَاثِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ، فَلَمَّا نَزَلَتْ آيَةُ الْمِيْرَاثِ نُسِخَتِ الْوَصِيَّةُ'' (۱)

دوسرے بعض حضرات نے یہ جواب دیا کہ ناسخ حدیث ابی امامہ ہے:

---

(۱) العرف الشذی حاشیۃ الترمذی (۲:۳۳)

حَیۡثُ قَالَ النَّبِیُّ صَلَی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ فِیۡ خُطۡبَتِہٖ عَامَ حَجَّۃِ الۡوَدَاعِ اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ قَدۡ اَعۡطٰی کُلَّ ذِیۡ حَقٍّ حَقَّہٗ، فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ اَلۡوَلَدُ لِلۡفِرَاشِ وَلِلۡعَاھِرِ الۡحَجَرُ (۱)

یہ حدیث "وَاِذَاحَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ" کے لئے ناسخ ہے، لیکن یہاں پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ والی حدیث تو خبر واحد ہے، اور یہ بات محقَّق ہے کہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی کرنا یا اس کو منسوخ کرنا بالکل جائز نہیں پھر یہ کہنا کہ لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ کے ذریعہ "اِذَاحَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ" منسوخ ہے، کیسے درست ہوسکتا ہے؟ یہی سوال علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے بھی تفسیر مظہری میں بیان کیا ہے:

وَالۡحَدِیۡثُ اَیۡ "لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ" حَدِیۡثُ الۡآحَادِ لَا یَجُوۡزُ بِہٖ نَسۡخُ الۡکِتَابِ"

اسی سوال کا جواب لکھتے ہوئے علامہ پانی پتی نے ایک تحقیقی بات لکھی ہے کہ:

"وَالتَّحۡقِیۡقُ اَنَّ الۡاٰیَۃَ مَنۡسُوۡخَۃُ الۡحُکۡمِ لِلۡاِجۡمَاعِ، عَلٰی عَدَمِ جَوَازِ الۡوَصِیَّۃِ لِوَارِثٍ اِلَّا عِنۡدَ رَضَاءِ الۡوَرَثَۃِ، وَاِتِّفَاقُ الۡاَئِمَّۃِ الۡاَرۡبَعَۃِ وَجَمۡھُوۡرِ الۡعُلَمَاءِ عَلٰی عَدَمِ وُجُوۡبِ الۡوَصِیَّۃِ لِغَیۡرِ الۡوَارِثِ مِنَ الۡاَقَارِبِ، فَلَا عِبۡرَۃَ بِہٖ لِمُخَالِفَتِھِمِ الۡجَمۡھُوۡرَ، وَاِذَا ثَبَتَ الۡاِجۡمَاعُ ظَھَرَ اَنَّہٗ ثَبَتَ عِنۡدَھُمۡ بِدَلِیۡلٍ قَطۡعِیٍّ نَاسِخٍ لِلۡاٰیَۃِ بِہٖ" وَالۡحَدِیۡثُ یَصۡلُحُ اَنۡ یَّکُوۡنَ سَنَداً لِلۡاِجۡمَاعِ" (۲)

بعض محدثین نے کہا لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ ہی ناسخ ہے، رہی یہ بات کہ یہ حدیث خبر

---

(۱) رواہ الترمذی ۳۲/۱۔ کتاب الوصایا عن رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(۲) التفسیر المظہری ۲۸۱/۱

واحد ہے، فَلَا یَجُوْزُ بِمِثْلِهِ نَسْخُ الْکِتَابِ، لہٰذا اس جیسی حدیث سے کتاب اللہ کو منسوخ کرنا جائز نہیں تو اس جواب یہ ہے کہ یہ حدیث خبر واحد نہیں بلکہ خبر مشہور ہے کیونکہ یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے، اور ضابطہ ہے یَجُوْزُ بِمِثْلِهِ نَسْخُ الْقُرْآنِ[1] اس جیسی حدیث سے قرآن کو منسوخ کرنا جائز ہے۔

(۱) بذل المجهود ۳۹/۴۔

گھر والوں کے رونے سے میّت کو عذاب ہوتا ہے

قَالُوْا: رَوَيْتُمْ: اِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ الْحَيِّ عَلَيْهِ[1] وَهٰذَا يَبْطُلُ مِنْ وَجْهَيْنِ،
(۱) اَحَدُهُمَا: يَقُوْلُ اللّٰهُ جَلَّ وَعَزَّ: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى۔
(۲) وَالْاٰخَرُ: يَقُوْلُ اللّٰهُ جَلَّ وَعَزَّ، قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ...... ثُمَّ قَالَ تَعَالٰى يَذْكُرُ

تخریج، "ان المیت یعذب ببکاء اهله"

(۱) رواه البخاری عن ابن عباس، کتاب الجنائز، باب قول النبی صلی الله علیه وسلم یعذب المیت ببعض بکاء اهله علیه، رقم الحدیث، ۱۲۸۷_

ومسلم عن حفصه، کتاب الجنازة، باب المیت یعذب ببکاء اهله علیه، برقم ۲۱۴۲_۲۱۴۳_

والترمذی عن سالم عن ابیه ابواب الجنائز، باب ماجاء فی کراهیة البکاء علی المیت، رقم الحدیث، ۱۰۰۲_)(۴) والنسائی عن عمر ابن الخطاب۔ کتاب الجنائز، باب فی البکاء علی المیت رقم الحدیث، ۱۸۴۹_

وابن ماجة عنه، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی المیت یعذب بما نیح علیه، رقم الحدیث، ۱۵۹۳_۱۵۹۴_۱۵۹۵_

واحمد_ ۹۲،۶۲/۱

اَحْوَالَ الْمَخْلُوْقِ مُنْذُ كَانَ طِيْنًا اِلٰى اَنْ يَبْعَثَهٗ، وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِيْنٍ۔ قَالُوْا: وَلَمْ يَذْكُرِ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَّهٗ يُحْيِيْهِ فِيْمَا بَيْنَ الْمَوْتِ وَالْبَعْثِ، فَكَيْفَ الْجَمْعُ؟

ترجمہ: معترضین نے کہا کہ تمہاری روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: زندوں کے رونے کی وجہ سے مُردے کو عذاب دیا جاتا ہے۔ یہ حدیث دو وجہ سے باطل ہے، ایک تو اس لئے کہ اللہ نے قرآن پاک میں کہا ہے کہ: "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى" یعنی تم میں سے کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، دوسرے اس لئے کہ اللہ نے ابتداء آفرینش سے لے کر بعث تک کا ذکر فرمایا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ موت و بعث کے درمیان بھی کوئی حیاۃ ہے، جس میں مردے کو عذاب دیا جائے گا؟

اعتراض: اشکال کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: زندوں کی نوحہ خوانی کی وجہ سے مُردے کو عذاب ہوتا ہے، جبکہ آیت کہہ رہی ہے کہ کوئی آدمی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا "یعنی کوئی بھی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا" لہٰذا حدیث بالا آیت کے بظاہر خلاف ہے؟ اس کی کیا توجیہ ہے؟

جواب: یہ اعتراض بہت ہی مشہور ہے، اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں، چند جوابات ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں، کیونکہ تمام جوابات کا احاطہ دشوار ہے:

جواب سے پہلے یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ روایت بخاری و مسلم کی ہے، روایت کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں، متعدد طرق سے صحیحین، سنن ودیگر کتبِ حدیث میں مروی ہے۔

① مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے روح المعانی کے حوالے سے یہ جواب دیا ہے کہ حدیث میں میت سے مراد مجازاً وہ شخص ہے جس کی موت کا وقت قریب ہو، اور تعذیب سے مراد تعذیب فی الدنیا ہے۔ اَیِ الْمُحْتَضَرُ یَتَاَلَّمُ بِبُکَاءِ اَھْلِہٖ، یہ تو دنیوی معاملہ ہوا، اور آیت "وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" سے اخروی معاملہ مراد ہے۔

② علامہ توریشتی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واسطہ سے جواب نقل کیا کہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مطلقاً اس حدیث کا انکار کرتی تھیں، اور وہ فرماتی تھیں:

اِنَّھَا تُعَذَّبُ بِکُفْرٍ فِیْ حَالِ بُکَائِھَا لَا بِسَبَبِ بُکَائِھَا۔

یعنی یہ روایت کافروں سے متعلق ہے نہ کہ مؤمنین سے متعلق، لہٰذا یہ حدیث آیت بالا کے معارض نہیں ہے۔

③ تیسرا جواب یہ ہے کہ: "بِبُکَاءِ" میں حرف "ب" معنوی اعتبار سے حال کے معنی میں ہے:

فَمَعْنَی الْحَدِیْثِ اِنَّ الْمَیِّتَ یُعَذَّبُ حَالَ بُکَاءِ اَھْلِہٖ عَلَیْہِ وَلَا یَلْزَمُ مِنْ ذٰلِکَ اَنْ یَکُوْنَ بُکَائُھُم سَبَبًا لِتَعْذِیْبِہٖ۔

ان دونوں قولوں کے متعلق علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ دونوں (یعنی دوسرا اور تیسرا) قول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

۴۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ داؤد ظاہری اور ایک طائفہ کے قول کے مطابق اشکال کی توجیہ یہ ہے کہ مردے پر ترکِ نوحہ کی وصیت کرنا واجب ہے، لہٰذا جس نے یہ وصیت نہیں کی اس کو واجب کے ترک کی وجہ سے عذاب ہوگا۔

کَمَا قَالَ ابْنُ الْمُرَابِطِ: "اِذَا عَلِمَ الْمَرْءُ بِمَا جَاءَ فِی النَّھْیِ عَنِ

النَّوْحِ وَعَرَفَ اَنَّ اَهْلَهٗ مِنْ شَأْنِهِمْ لَيَفْعَلُوْنَ ذٰلِكَ وَاِنَّهٗ لَمْ يُعْلِمْهُمْ بِتَحْرِيْمِهٖ وَلَا زَجَرَ عَنْ تَعْلِيْمِهٖ فَاِذَا عُذِّبَ عَلٰى ذٰلِكَ عُذِّبَ بِفِعْلِ نَفْسِهٖ لَا بِفِعْلِ غَيْرِهٖ بِمُجَرَّدِهٖ"

۵۔ ابن حزم نے یہ جواب دیا ہے کہ اس سے مراد میت کو ان صفات پر عذاب دینا ہے کہ جن صفات کو لوگ محاسن ومفاخر کے طور پر شمار کر کے میت پر نوحہ خوانی کرتے ہیں جبکہ وہ صفات اخلاقاً وشرعاً مذموم ہوں۔

مثلاً ان کا یہ کہنا کہ عورتوں کو بیوہ بنانے والے، اولاد کو یتیم بنانے والے، مکانوں کو ویران کرنے والے وغیرہ یہ وہ کام ہیں جن کو وہ لوگ ظلماً کیا کرتے تھے، لیکن انہی کو وہ محاسن کے طور پر شمار کر کے رویا کرتے تھے، بعض شارحین حدیث نے ابن حزم کے جواب کو پسند کیا ہے۔

۷۔ لیکن سب سے زیادہ پسندیدہ اور صحیح جواب یہ ہے کہ "اِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ حَالَ بُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ" جو حدیث میں ہے، یہ اس شخص کے متعلق ہے، جس نے بوقت موت اپنے اوپر نوحہ خوانی اور رونے وغیرہ کی وصیت کی ہو، جس طرح زمانۂ جاہلیت میں لوگ اس قسم کی وصیت کیا کرتے تھے، کما قال طرفۃ ابن العبد:

اِذَا مِتُّ فَانْعِيْنِيْ بِمَا اَهْلُهٗ
وَشُقِّيْ عَلَيَّ الْجَيْبَ يَا ابْنَةَ مَعْبَدِ

خلاصہ یہ ہے کہ جس نے نوحہ وغیرہ کی وصیت کی ہو اس کو عذاب دیا جائے گا، اور جس نے نوحہ وغیرہ کی وصیت نہیں کی ظاہر ہے کہ اسے عذاب نہیں ہوگا، یہ قول بہت سے علماء کا ہے، مثلاً علامہ مزنی رحمۃ اللہ علیہ وابراہیم رحمۃ اللہ علیہ، حتی کہ ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ اکثر اہل علم کی رائے ہے، جیسا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے، اور یہی حنفیہ کا مختار قول بھی ہے:

"اِنَّمَا يُعَذَّبُ الْمَيِّتُ بِبُكَاءِ اَهْلِهٖ اِذَا اَوصٰى الْمَيِّتُ بِذٰلِكَ كَمَا فِى الدُّرِ الْمُخْتَارِ ـ

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری، باب البکاء علی المیت ۱۹۷/۵، اوجز المسالک وغیرہ۔

قرآنِ کریم کیسے محفوظ ہوا؟

رَوَيْتُمْ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ عَنْ عَمْرَةَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّهَا قَالَتْ: لَقَدْ نَزَلَتْ آيَةُ الرَّجْمِ، وَرَضَاعُ الْكَبِيرِ عَشْرًا، فَكَانَتْ فِي صَحِيفَةٍ تَحْتَ سَرِيرِي عِنْدَ وَفَاةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا تُوُفِّيَ وَشُغِلْنَا بِهِ: دَخَلَتْ دَاجِنٌ لِلْحَيِّ، فَأَكَلَتْ تِلْكَ الصَّحِيفَةَ(۱)

وَهٰذَا خِلَافُ قَوْلِ اللهِ تَعَالَىٰ "وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ، لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ".

فَكَيْفَ يَكُونُ عَزِيزًا، وَقَدْ أَكَلَتْهُ شَاةٌ، وَأَبْطَلَتْ فَرْضَهُ وَسَقَطَتْ حُجَّتُهُ، وَأَيُّ أَحَدٍ يَعْجِزُ عَنْ إِبْطَالِهِ، وَالشَّاةُ تُبْطِلُهُ، وَكَيْفَ قَالَ: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي، وَكَيْفَ عَرَّضَ الْوَحْيَ لِأَكْلِ شَاةٍ، وَلَمْ يَأْمُرْ بِإِحْرَازِهِ وَصَوْنِهِ؟ فَكَيْفَ التَّوْفِيقُ؟

ترجمہ: تم نے روایت کی ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے، وہ فرماتی

(۱) اخرجہ ابن ماجة، کتاب النکاح، باب رضاع الکبیر، رقم الحدیث، ۱۹۴۴ ۔ الداجن: ھی الشاة یعلفھا الناس فی منازل، وقد یقع علی غیر الشاة من کل ما یالف البیوت من الطیر وغیرھا، (المنجد)، وتاویل مختلف الحدیث ص ۳۷۲

ہیں، کہ آیت رجم نازل ہوئی اس حالت میں کہ بڑے کی مدت رضاعت دس گھونٹ تھی، وہ صحیفہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت میری چارپائی کے نیچے تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور ہم سب مشغول ہوگئے، تو ایک محلّہ کی داجن (وہ بکری جسے لوگ اپنے گھروں میں پالتے ہیں اور چارہ وغیرہ دیتے ہیں) گھر میں داخل ہوئی اور صحیفہ کو کھا گئی۔

معترضین نے کہا کہ یہ حدیث اللہ کے قول "قرآن بڑی باوقعت کتاب ہے، جس میں غیر واقعی بات نہ اُس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے (یعنی اس میں کسی پہلو اور کسی جہت سے اس کا احتمال نہیں کہ یہ اللہ کا کلام نہ ہو) یہ خدائے حکیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے" کے خلاف ہے، لہٰذا قرآن کریم پھر کیسے عزیز ہوا، اور کیسے اس کو محفوظ کہہ سکتے ہیں؟

اعتراض: اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بکری گھر میں داخل ہوئی، اور وہ قرآن کریم کے ایک صحیفہ (یعنی ایک ٹکڑے) کو کھا گئی، جبکہ قرآن کریم کی آیت اور عقل حدیث مذکور کے خلاف ہے، یعنی حدیث کی بات عقل کے بھی خلاف معلوم ہوتی ہے، اور آیات کے بھی بظاہر خلاف معلوم ہوتی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں تو ہے کہ اللہ نے کہا کہ "ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"، اسی طریقہ سے دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ "قرآن مقدس بڑی باوقعت کتاب ہے، جس میں غیر واقعی بات نہ اُس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے، نہ اس کے پیچھے کی طرف سے آسکتی ہے، مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی پہلو اور کسی بھی سمت سے اس بات کا احتمال ہی نہیں پیدا ہوتا، کہ یہ کتاب عزیز منزل من اللہ نہ ہو، اور پھر خلاف واقع اس کو منزل من اللہ کہہ دیا جائے، اور عقل کے خلاف

اس معنی کر ہے کہ قرآن کیسے عزیز رہا، جبکہ ایک بکری اس کو کھا گئی، لہٰذا اس کی فرضیت بھی ساقط ہوگئی اور حجیت بھی باطل ہوگئی، اور جب ایک بکری اس کو باطل کرسکتی ہے تو پھر کوئی آدمی کیوں نہیں کرسکتا، نیز "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" والی آیت کے بھی خلاف ہوگئی، نیز جب اس صحیفہ پر عمل کا ارادہ ہی نہیں تھا تو پھر اس کو نازل کرنے کی زحمت کاہے کو اٹھائی گئی؟

جواب: یہ روایت قدیم زمانہ سے ہی معترضین کا نشانہ بنی رہی ہے اور اس کی صحت سے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات ظاہر کیے گئے، علماء کی جانب سے ہر دور میں اس طرح کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا رہا ہے، جن میں علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے حدیث سے متعلق پھیلائے جانے والے شکوک وشبہات کے ازالہ کی کافی کامیاب کوشش کی اور معترضین کی جانب سے اٹھائے جانے والے سوالوں کا مدلّل جواب دیا، اسی طریقہ سے علامہ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے بھی "تاویل مختلف الحدیث" میں مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہوئے سیر حاصل بحث کی ہے۔

۱۔ سوال مذکور کا مختصر جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ درحقیقت حدیث وآیت اسی طریقہ سے حدیث وعقل کے مابین کوئی تعارض ہی نہیں کیونکہ بکری کاغذ کو کھاسکتی ہے، جیسا کہ مشاہدہ بھی ہے کہ جانور وغیر کاغذ کو کھالیتے ہیں، چبا لیتے ہیں، اور جہاں تک بات رہی کہ یہ کھانا آیت اللہ کے بظاہر خلاف معلوم ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ پاک نے "لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ" میں باطل سے یہ مراد لیا ہی نہیں ہے کہ مصاحف پر کوئی آفت آہی نہیں سکتی، اس لئے کہ ممکن ہے اسے جلا دیا جائے یا اسے دفن کر دیا جائے، یا کسی آسمانی

آفت سے وہ دوچار ہو جائے بلکہ "لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ" کا مطلب یہ ہے کہ شیطان مصاحف میں خرد برد نہیں کرسکتا یعنی کوئی ایسی چیز جو حقیقت میں مصاحف میں نہ ہو اس کو وہ داخل نہیں کرسکتا، نہ وحی سے پہلے نہ وحی کے بعد، یہ کام شیطان کے بس سے باہر ہے، لہٰذا اس سے بداہۃً یہ بات معلوم ہوگئی کہ مصاحف پر جلنے، ڈبونے، وغیرہ کی آفت آسکتی ہے، اور یہ آیت کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ علامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ:

"وَاَمَّا قَوْلُ اللّٰہِ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی "لَا یَأْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ" فَاِنَّہٗ تَعَالٰی: لَمْ یُرِدْ بِالْبَاطِلِ، اِنَّ الْمَصَاحِفَ لَا یَحِیْبُھَا مَا یَحِیْبُ سَائِرَ الْاَعْلَاقِ وَالْعُرُوْضِ۔ وَاِنَّمَا اَرَادَ: اِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُدْخَلَ فِیْہِ مَا لَیْسَ مِنْہُ قَبْلَ الْوَحْیِ وَبَعْدَہٗ" (تاویل مختلف الحدیث ص ۳۷۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول "کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی"

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَنَّهُ قَالَ: نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ، وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ، وَيَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا، لَقَدْ كَانَ يَاْوِیْ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ، وَلَوْلَبِثْتُ فِی السِّجْنِ طُوْلَ مَا لَبِثَ يُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ۔ (۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہم شک کرنے کے زیادہ حقدار ہیں حضرت ابراہیم سے، جب انہوں نے عرض کیا تھا، اے میرے پروردگار مجھے دکھلا دیجئے کہ آپ مُردوں کو کس طرح (کس کیفیت) سے زندہ کریں گے؟ ارشاد ہوا کیا تجھے یقین نہیں ہے"؟ عرض

تخریج۔ "نحن احق بالشک من ابراهیم"

(۱) رواه البخاری عن ابی هریره رضی الله عنه، کتاب الانبیاء، باب قوله "وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرَاهِيْمَ" رقم الحدیث، ۳۳۷۲۔ ۳۳۷۲۔ ۴۵۳۷۔ ۴۶۹۴۔ ۶۹۹۲

ومسلم عنه۔ کتاب الایمان، باب زیادة طمانینة القلب بتظاهر الادلة، رقم الحدیث، ۳۸۳۔ ۲۸۳

ورواه ابن ماجه عن ابی هریرة رضی الله عنه۔ (کتاب الفتن، باب العبر علی البلاء، رقم الحدیث، ۴۰۲۶)

واحمد فی مسنده، ۲/۳۲۶

کیا: یقین تو ضرور ہے، لیکن یہ درخواست اس لئے ہے کہ قلب کو اطمینان ہو جائے (جو آنکھ سے دیکھ کر ہوتا ہے) اور اللہ لوط پر رحم کرے، وہ زبردست رکن (یعنی خداوند کریم) کی پناہ لیتے تھے، اگر اتنی مدت میں قید رہا ہوتا جتنی یوسف علیہ الصلوۃ والسلام رہے تو داعی کا پیغام رہائی قبول کر لیتا۔

اعتراض: اس حدیث پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انبیاء کرام پر اور خود اپنی ذات پر طعن فرمایا، جن سے بظاہر ان حضرات انبیاء کے نقص شان کا شبہ ہوتا ہے۔

جواب: آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لئے رحمت بنا کر معبوث کئے گئے، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس حقیقت کو ان الفاظ کے ذریعہ آشکارا کیا، "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" (الانبیاء:۱۰۷) چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کریمی اور آپ کی نبیانہ اخوت دوسرے نبیوں کی عزت واحترام بیان کرنے اور اپنی فروتنی کے اظہار کے لئے گویا بہانے کی تلاش میں رہا کرتی تھی، اگر کہیں اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا ذرا سا ذکر بھی آ گیا تو عظمت وبرتری کے جتنے زوردار کلمات ہو سکتے تھے، وہ سب ان کے حق میں، اور عجز ونیاز کے جتنے کلمات ممکن ہوتے وہ تمام کے تمام اپنے حق میں استعمال ہوتے تھے، اور جب کہیں اپنے دوسرے بھائیوں کی یاد تازہ ہو گئی تو فوراً آپ کے تلطف وترحم کے سمندر موجزن ہو جاتے اور شفقت ورحمت، محبت ورافت سے لبریز دعائیں زبان مبارک سے نکلنے لگتیں، مذکورہ حدیث پاک میں دراصل انہی چیزوں کا ظہور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ہوا، نہ کہ مطاعن کا ظہور، جیسا کہ معترض کو شبہ ہوا۔ کیونکہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شانِ عالی اور شک سے

آپ کی براءت کا اعلان کرنا ہے، کیونکہ بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب "رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی" والی آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زبان سے نکلا "شَکَّ اِبْـرَاھِیْـمُ وَلَمْ یَشُکَّ نَبِیُّنَا" (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک ہوا جبکہ ہمارے نبی نے شک نہیں کیا، اس پر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی والی آیت پر حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے سوال کرنے کا باعث، معاذ اللہ، شک وتردد نہ تھا، ورنہ اگر بالفرض والمحال (Spose) ان سے یہ سوال کسی شک وشبہ کی وجہ سے ہوتا تو ہم اس کے زیادہ حقدار ہوتے، کیونکہ بعض فروعات عملیہ و نیز ملت ابراہیمیہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام متبوع اور ہم تابع ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، "مِلَّةَ اِبرَاھِیمَ حَنِیْفًا" (الانعام:۱۶۱) "فَاتَّبِعُوْ مِلَّةَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیفًا" (آل عمران:۹۵) "مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ" (الحج: آیت نمبر ۷۸)

لیکن جب ہم تابعین کو شک لاحق نہیں ہوا، تو پھر متبوع اور اس موحد اعظم کو کس طرح شک پیدا ہوسکتا ہے، غرض یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد اظہار شک قطعاً نہ تھا، بلکہ صرف احیاء موتی کی کیفیت کا مشاہدہ ومعاینہ کرنا تھا، جیسا کہ لفظ "کَیْفَ" اس بات کی بھرپور غمازی کررہا ہے، اور یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ شوق کے سوال اور سوال شک میں زمین وآسمان کا فرق ہے، جہاں تک بات رہی سوال شوق کی تو یہ عین تقاضائے یقین ہے، کہ اگر خداوند قدوس کے احیاء موتی پر یقین نہ ہو تو کیفیتِ احیاء کے مشاہدہ کا جذبہ وشوق ہی کیسے پیدا ہوگا، کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا معصوم اور بے گناہ ہونا عقلاً ونقلاً ضروری ہے، اس لیے احیاء موتی کے بارے میں ان سے کسی بھی طرح کا شک وصدور محال اور ناممکن ہے، لہٰذا اس حدیث کا اصل

مقصد یہ نہیں کہ چونکہ ''ابراہیم علیہ السلام کو شک ہوا تھا اس لئے میں اس کا زیادہ حق دار ہوں؟ بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے شک کے نہ ہونے سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے شک کے نہ ہونے پر استدلال کرنا مقصود ہے، لہٰذا یہ بات بالکل بے غبار ہوگئی کہ افضل الانبیاء جناب نبی کریم سلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق صدور شک کا قطعاً کوئی امکان نہیں، نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شک کے ازالہ کے سلسلے میں یہ بات بھی کافی مضبوط معلوم ہوتی ہے کہ احیاء موتی کی قدرت کا یقین تو ایمان کا جزو لاینفک ہے اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو یقین تو پہلے سے ہی حاصل تھا اسی لئے تو آپ نے نمرود کے ساتھ مناظرہ میں فرمایا تھا ''رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ'' لیکن چونکہ آپ کے دل میں احیاء موتی کی مختلف صورتیں اور کیفیتیں آتی تھیں کہ نہ معلوم اللہ تعالیٰ کے احیاء موتی کی کیا صورت ہوگی، چونکہ انسانی فطرت ہے کہ جس کا مشاہدہ نہ ہو خواہ کتنا ہی یقینی کیوں نہ ہو، اس میں اس کے خیالات وتصورات منتشر رہتے ہیں کہ یہ کیسے اور کیونکر متصور ہوگا؟ یہ ذہنی انتشار سکون قلب اور کمال اطمینان میں خلل انداز ہوتا ہے، اس لیے اس مشاہدہ کی درخواست کی گئی تاکہ احیاء موتی کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو اور قلب کو اطمینان وسکون نصیب ہو۔

علامہ ابن قتیبہؒ نے بھی مذکورہ سوال کا بہت ہی تفصیل کے ساتھ جواب دیا ہے۔ ان کے جواب کا حاصل تقریباً اوپر کی تشریح میں آچکا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

اَنَا اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِيْمُ۔

''تَوَاضُعًا مِنْهُ، وَتَقْدِيْمًا لِاِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلٰى نَفْسِهِ، يُرِيْدُ: اِنَّا لَمْ نَشُكَّ وَنَحْنُ دُوْنَهُ، فَكَيْفَ يَشُكُّ هُوَ؟ وَتَاْوِيْلُ

قَوْلِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ "وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي" أَيْ يَطْمَئِنَّ بِيَقِينِ الْبَصَرِ، وَالْيَقِينُ قِسْمَانِ: أَحَدُهُمَا يَقِينُ السَّمْعِ، وَالْآخَرُ يَقِينُ الْبَصَرِ۔

يَقِينُ الْبَصَرِ أَعْلَى الْيَقِينِ، وَلِذٰلِكَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَيْسَ الْمُخْبَرُ كَالْمُعَايِنِ"۔۔۔۔فَأَرَادَ إِبْرَاهِيمُ أَنْ يَطْمَئِنَّ قَلْبُهُ بِالنَّظَرِ الَّذِيْ هُوَ أَعْلَى الْيَقِينِ۔۔۔۔"[1]

"وَرَحِمَ اللهُ لُوطاً، إِنْ كَانَ لَيَأْوِيْ إِلَى رُكْنٍ شَدِيْدٍ"اس جملہ سے بظاہر حضرت لوط علیہ الصلوۃ والسلام پر طعن کا شبہ پیدا ہوتا ہے، اور یہی شبہ اعتراض کا باعث ہے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس جملے سے دراصل طعن کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد اس جملے سے لوط علیہ السلام کی سخت پریشانی واضطراب کے پیش نظر ترحم واظہار شفقت ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے بصورت مہمان تشریف لائے اور بدکردار لوگوں نے انہیں تنگ کیا تو اس وقت لوط علیہ السلام دل میں تو اللہ پاک سے ملتجی تھے جو رکن شدید ومضبوط و مستحکم قلعہ کی مانند ہے مگر ظاہر میں مہمانوں سے معذرت کے لئے عاجزانہ انداز میں یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ کاش اگر میرا کوئی کنبہ وقبیلہ ہوتا تو میری مدد کرتا، اور لوط علیہ السلام کا یہ فرمان حفاظت خداوندی پر مکمل اعتماد کے باوجود بتقضائے بشریت مہانوں کی حفاظت کی خاطر اسباب ظاہریہ کو اختیار کرنے کے لئے تھا، اندازہ لگایئے کہ قوم کے سارے ناہنجار افراد ایک طرف، اور حضرت لوط علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی آبرو کا معاملہ ایک طرف، نہ خود اپنے دست وبازو میں مدافعت کی قوت نہ اپنا قبیلہ، کیونکہ لوط علیہ السلام

---

(۱) تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبہ ص ۱٦۰

اپنے چچا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ عراق سے ہجرت کر کے آئے تھے، یہاں شام کے لوگوں کا قبیلہ زوردار تھا، اس مجبوری و بے چارگی کا نقشہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبیانہ اخوت کے سامنے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تڑپ اٹھے، اور ایک گذشتہ مصیبت کی ایک تازہ واقعہ کی طرح چوٹ لگی، اور بڑے درد کے انداز میں، "رَحِمَ اللّٰهُ لُوطًا۔۔۔" الٰہی میرے بھائی لوط پر رحمتیں نازل کر کہ انہیں قوم کی نالائقیوں سے تنگ آ کر رکن شدید کی پناہ لینے کی نوبت آ گئی، جو فطرت بشری سے مجبوری کی حالت میں عام طور پر پیش آیا کرتی ہے:

وَلَوْلَبِثْتُ فِي السِّجْنِ طُوْلَ مَا لَبِثَ يُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِيَ۔

اس جملے سے بظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات پر طعن کر رہے ہیں، جیسا کہ علامہ ابن قتیبہ نے کہا:

"هٰذَا طَعْنٌ عَلٰى نَفْسِهِ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ"

اس جملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام کی جگہ میں ہوتا اور اتنی طویل مدت قید خانہ میں رہتا تو مکث طویل، اور قید بامشقت کے پیش نظر قاصد کے پیغام رہائی کو ضرور قبول کر لیتا اور غلامی کی زندگی پر آزادی کی زندگی کو ترجیح دیتا اور اسی وقت جیل خانہ کی تاریک فضا سے نکل کر آزادی کی پر رونق فضا میں سانس لیتا، مگر یوسف علیہ السلام کا یہ صبر عظیم تھا کہ آپ نے ایسے موقع پر بھی جواں مردی، اور صبر و استقلال کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ "لَاَجَبْتُ الدَّاعِيَ" پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے، کہ "لَاَجَبْتُ الدَّاعِيَ" سے حضرت یوسف علیہ السلام کی افضلیت کا وہم پیدا ہوتا ہے، جبکہ یہ بات محقق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء والرسل ہیں۔

یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ ہم پر جن بزرگوں کا سب سے زیادہ احسان ہے وہ سب شکریہ کے مستحق ہیں، جن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے زمانہ میں، اپنے اپنے قبیلہ میں اس زمانہ کے مناسب حال اخلاق عالیہ وصفات نبیلہ کا ایک نہ ایک بلند ترین معجزانہ نمونہ پیش کیا، کسی نے صبر، کسی نے قربانی، کسی نے عفت، کسی نے زہد، کسی نے ہمدردی وغمخواری، کسی نے دعوت، کسی نے ولولۂ حق، لیکن ضرورت تھی ایک ایسے رہنما کی، ایک ایسے رہبر کی جو اس سرے سے لیکر اس سرے تک پوری انسانیت کو اپنی عملی مثالوں کا ایک گائڈ بک دیدے جس کو لے کر ہر مسافر بے خطر منزل مقصود کا پتہ پالے، یہ رہنما سلسلہ انبیاء کے آخری نبی ورسول جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، آپ سید المرسلین وخاتم النبیین بن کر مبعوث ہوئے آپ افضل الانبیاء والرسل ہیں، یہ آپ کی کلی فضیلت ہے، اس میں دو رائے نہیں ہیں لیکن "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ" (یہ رسل ہیں بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے) کے پیش نظر بعض انبیاء کی بعض انبیاء پر فضیلت جزئیہ ثابت ہوجاتی ہے۔ اور یہ جزئی فضیلت کلّی فضیلت کے منافی نہیں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے طریقۂ کار میں ان کے صبر وتحمل کا عظیم الشان ثبوت ہے، جو اپنی جگہ قابل تعریف ہے، لیکن آپ نے جس طریقۂ کار کو اپنی طرف منسوب کیا تعلیم امت اور اصلاح عوام کی خیر خواہی کے پیشِ نظر یہی مناسب ہے۔ علامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ بھی تقریباً یہی توجیہ پیش فرماتے ہیں:

> وَاَمَّا قَوْلُهٗ: لَوْ دُعِيْتُ اِلٰی مَا دُعِيَ اِلَيْهِ يُوْسُفُ لَاَجَبْتُ، يَعْنِيْ حِيْنَ دُعِيَ لِلْاِطْلَاقِ مِنَ الْحَبْسِ، بَعْدَ الْغَمِّ الطَّوِيْلِ، فَقَالَ

لِلرَّسُوْلِ "اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ" وَلَمْ یَخْرُجْ مِنَ الْحَبْسِ فِیْ وَقْتِهٖ، یَصِفُهٗ بِالْاَنَاةِ وَالصَّبْرِ، وَقَالَ: اَیْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: وَلَوْ كُنْتُ مَكَانَهٗ، ثُمَّ دُعِیْتُ اِلٰى مَادُعِیَ اِلَیْهِ مِنَ الْخُرُوْجِ مِنَ الْحَبْسِ، لَاَجَبْتُ، وَلَمْ اَتَلَبَّثْ۔ هٰذَا اَیْضًا مِنْ جِنْسِ تَوَاضُعِهٖ، لَا اَنَّهٗ كَانَ عَلَیْهِ، لَوْكَانَ مَكَانَ یُوْسُفَ، فَبَادَرَوَ خَرَجَ، اَوْ عَلٰى یُوْسُفَ لَوْ خَرَجَ مِنَ الْحَبْسِ مَعَ الرَّسُوْلِ، نَقَصَ وَلَا اِثْمَ۔ وَاِنَّمَا اَرَادَ اَنَّهٗ لَمْ یَكُنْ یَسْتَثْقِلُ مِحْنَةَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ لَهٗ فَیُبَادِرُ وَیَتَعَجَّلُ، وَلٰكِنَّهٗ كَانَ صَابِرًا مُحْتَسِبًا۔ (۱)

(۱) تاویل مختلف الحدیث، ص ٦٦

سورج شیطان کے دوسینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے

قَالُوْا: رَوَيْتُمْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: إِنَّ الشَّمْسَ تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيْ شَيْطَانٍ فَلَا تُصَلُّوا لِطُلُوْعِهَا (۱)
وَفِي رِوَايَةٍ، إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ فَهُوَ فِيْ هٰذَا الْحَالِ: أَلْطَفُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ، وَهُوَ فِيْ تِلْكَ الْحَالِ، أَعْظَمُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ"۔

ترجمہ: معترضین نے کہا کہ تمہاری روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ ''بے شک سورج، شیطان کے دوسینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے،

تخریج، "ان الشمس تطلع بين قرني الشيطان

(۱) رواہ البخاری، (کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس وجنودہ، رقم الحدیث، ۳۲۷۳۔ ۱۱۹۲۔۱۶۲۹۔ ۳۳۰۳۔ ۳۴۹۔ ۳۴۸۷) وابن ماجة، کتاب الصلوة، باب ماجاء فی الساعات التی تکرہ فیھا الصلوة، رقم الحدیث، ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔

ومسلم۔ کتاب صلاة المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسة، رقم الحدیث، ۱۹۳۰

والنسائی۔ کتاب مواقیت، باب النھی عن الصلوة رقم الحدیث، ۵۷۰۔ ۵۷۳

وابوداؤد، کتاب التطوع، باب من رخص فیھا اذا کانت الشمس مرتفعة، رقم الحدیث، ۱۲۷۷۔

لہٰذا سورج کے طلوع ہونے کے وقت نماز مت پڑھو۔

پس تم نے شیطان کے لئے ایسے سینگ بیان کئے جو آسمان تک پہنچتے ہیں، حالانکہ سورج زمین سے کئی گنا زیادہ بتایا جاتا ہے، تو یہ سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان میں کیسے نکلتا ہے، اور نیز تمہاری روایت ہے کہ شیطان ابن آدم کے اندر اسی طرح گردش کرتا ہے جس طرح خون گردش کرتا ہے۔

اعتراض: روایت مذکورہ پر عقلی اعتبار سے اعتراض وارد ہوتا ہے، پہلے روایت کا مطلب لکھا جاتا ہے...... یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سورج کے طلوع ہونے کے وقت نماز مت پڑھو، کیونکہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے، جبکہ دوسری روایت بخاری شریف میں ہے جو متعدد طرق سے مروی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ شیطان ابن آدم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔

اعتراض کا پہلو یہ ہے کہ پہلی روایت میں یہ کہا گیا کہ سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے تو اس میں شیطان کے لئے ایسے سینگ بیان کئے گئے ہیں جو اتنے لمبے ہیں کہ آسمان تک پہنچتے ہیں، اور یہ بات محقَّق ہے کہ سورج زمین سے کئی گنا زیادہ بڑا ہے، تو اتنا بڑا سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان سے کیسے طلوع ہوگا؟ جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ شیطان ابن آدم کے خون کی نالیوں سے گذرتا ہے، تو اس روایت کے پیشِ نظر شیطان سب سے زیادہ باریک ہوا اور پہلی روایت کے اعتبار سے سب سے بڑا ہو گیا، جیسا کہ ابن قُتیبہ نے بھی کہا ہے:

فَهُوَ فِيْ هٰذَا الْحَالِ : اَلْطَفُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ، وَهُوَ فِيْ تِلْكَ الْحَالِ، اَعْظَمُ مِن كُلِّ شَيْءٍ"۔ فَكَيْفَ الْمُخْلَصُ؟

اس اعتراض کو اور مزید واضح انداز میں یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات نہایت ہی باوثوق طریقہ سے کہی جاسکتی ہے کہ سورج کی موٹائی ساڑھے بتیس ارب میل ہے، اگر اتنا بڑا سورج شیطان کے دوسینگوں میں سماجاتا ہے.....تواتنا بڑا شیطان کہاں ٹھہرتا ہوگا؟

جواب: معترضین حضرات کوحدیث مذکور پر بڑی غلط فہمی ہوئی، غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے مادّی عینک سے اس حدیث کو دیکھا، نیز یہ حضرات شیاطین اور جنات کی تخلیق پر ایمان نہیں لاتے، جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے شیاطین اور جنات کو پیدا کیا، اوران کو یہ قدرت دے دی ہے کہ وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا چاہیں تومنتقل ہوسکتے ہیں، نیز انہیں یہ بھی قدرت ہے کہ کبھی وہ کسی شیخ کامل کی صورت اختیار کرلیں تو کبھی کسی خوبصورت نوجوان کی شکل کو اپنالیں، کبھی آگ کی صورت تو کبھی کتے اور دیگر جانوروں کی صورت میں متمثل ہوجائیں، اور کبھی اتنے چھوٹے ہوجائیں کہ قلبِ انسانی تک اُن کی رسائی ہوجائے، اور کبھی اتنے باریک ہوجائیں کہ ابن آدم کے خون کی نالیوں سے بھی گزرجائیں.....لہٰذا.....اس حقیقت کی روشنی میں اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ابن قتیبہ نے بھی اس حقیقت کوواضح کیا ہے:

قَالَ اَبُوْ مُحَمَّدٍ: وَنَحْنُ نَقُوْلُ: "اِنَّ اِنْكَارَهُمْ لِهٰذَا الْحَدِيْثِ، اِنْ كَانَ مِنْ اَجْلِ اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِخَلْقِ الشَّيٰطِيْنِ وَالْجِنِّ، وَبِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَعَلَ فِيْ تَرْكِيْبِهَا اَنْ تَتَحَوَّلَ مِنْ حَالٍ اِلٰى حَالٍ فَتَتَمَثَّلَ مَرَّةً فِيْ صُوْرَةِ شَيْخٍ، وَمَرَّةً فِيْ صُوْرَةِ شَابٍّ، وَمَرَّةً فِيْ مِثَالِ نَارٍ، وَمَرَّةً فِيْ مِثَالِ كَلْبٍ، مَرَّةً فِيْ مِثَالِ جَانٍّ، وَمَرَّةً

تَصِلُ إِلَى السَّمَاءِ، وَمَرَّةً تَصِلُ إِلَى الْقَلْبِ، وَمَرَّةً تَجْرِيْ مَجْرَى الدَّمِ"[۱]

بہر حال معترضین کو اعتراض اس لئے ہوا کہ انہوں نے مادّی عینک سے ان حدیثوں کو دیکھا، اگر یہ حضرات ان حدیثوں پر بلا کیف وتاویل ایمان لاتے (جیسا کہ ہم مومنین کا ایمان ہے) تو یہ اعتراض ہوتا ہی نہیں۔ لیکن......

خیر! روایت مذکورہ کی مزید ضروری تشریح کرنے سے پہلے سائل کی ذہنیت کو تسکین دینے کے لئے عقلی اعتبار سے یہ جواب بہت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ معترض کو جو شبہ ہوا کہ سورج جب اتنا بڑا ہے، اور وہ سینگ میں گھس جاتا ہے تو شیطان کہاں کھڑا ہوتا ہوگا؟ تو عرض یہ کرنا ہے کہ حدیث کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم یہ فرض کریں کہ شیطان سورج کے سامنے اس طرح کھڑا ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو سورج اس کے دو سینگوں کے درمیان دکھائی دے، جیسا کہ ہم اپنی دو انگلیوں کو علیحدہ کر کے آنکھ سے ذرا دور سورج کی طرف کر لیں تو سورج (جو ساڑھے بتیس ارب میل ہوتا ہے) ٹھیک ہماری دو انگلیوں کے درمیان دکھائی دے گا، لہٰذا اسی طریقہ سے سورج بھی دو سینگوں کے درمیان دکھائی دے تو اس میں حیرت واستعجاب کی کیا بات ہے؟ یہ جواب تو آپ کی تسکین کی خاطر ہے ورنہ ہم ایمان والے تو قرآن کریم اور مخبر صادق کی ہر بات پر بلا کیف وتاویل ایمان لاتے ہیں، اور اس کے سچا ہونے کا پورا پورا یقین رکھتے ہیں، کیونکہ اگر ہم ہر بات کو مشاہدہ اور عقل کی کسوٹی پر پرکھیں تو پھر "يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔ ہمارے لئے صرف اتنا کافی ہے، اور اس حدیث سے یہی سبق ملتا ہے کہ ہم یقین کر لیں یہ شیطانی

(۱) تاویل مختلف الحدیث، ص ۴۹۱

اوقات ہیں، ان ہی اوقات میں شیطان کے اولیاء کفار، طاغوت کی عبادت کرتے ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔"وَحِيْنَئِذٍ يَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّارُ"(۱)

جیسا کہ یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ بہت ساری پہلی امتیں سورج کی پرستش کرتی تھیں، ان کے لئے سجدہ کرتی تھیں، اس بات کی شہادت قرآن کریم کی آیت سے بھی ہوتی ہے مثلاً......

وَقَدْ دَرَجَ كَثِيْرٌ مِنَ الأُمَمِ السَّالِفَةِ، عَلٰى عِبَادَةِ الشَّمْسِ وَالسُّجُوْدِ لَهَا، فَمِنْ ذٰلِكَ مَا قَصَّ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى عَلَيْنَا فِيْ نَبَإِ مَلِكَةِ سَبَأَ: إِنَّ الهُدْهُدَ قَالَ لِسُلَيْمَانَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ، "وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ"(۲)

تفصیل کے لئے دیکھئے تاویل مختلف الحدیث ص ۱۹۵

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ ہم لوگ ایسے وقت میں اپنے حقیقی رب ذوالجلال کی عبادت کریں جس وقت معبودانِ باطلہ کے متبعین اپنے باطل معبودوں کی پوجا کرتے ہیں، اس لئے آپ نے ارشاد فرمایا:"إِنَّ الشَّمْسَ تَطْلُعُ مِنْ بَيْنِ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ فَلَا تُصَلُّوهَا" رہی یہ بات کہ قرن سے آپ کی کیا مراد تھی، تو اس سلسلہ میں متعدد اقوال ہیں، قرن سے متعلق جو اشکال ہوا اس کا ایک جواب تو گذر گیا، دوسرا جواب یہ ہے کہ قرن سے مراد وہ نہیں جو سائل نے تصور کرلیا کہ جیسے گائے کے سینگ ہوتے ہیں، اور جیسے بکری اور بھینس کے سینگ ہوتے ہیں، یہ آپ نے مراد نہیں لیا بلکہ آپ کی مراد یہ تھی "حرف الراس" یعنی سر کا کنارہ اور ظاہر

(۱) رواہ مسلم، کتاب الصلوۃ، باب الاوقات الصحیحۃ۔

(۲) سورۃ النمل: ۲۴

ہے کہ سر کے دو کنارے اور دو پہلو ہوتے ہی ہیں، کما قال ابن قتیبہ :

وَاِنَّمَا الْقَرْنُ هٰهُنَا حَرْفُ الرَّاسِ وَلِلرَّاسِ قَرْنَانِ، اَیْ حَرْفَانِ وَجَانِبَانِ فَلَا اِشْكَالَ عَلَيْهِ وَهٰذَا هُوَ الاَصَحُّ۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ قرنین سے شیطان کی ''دو جماعتیں'' مراد ہیں، جو بوقت طلوع وغروب مطلع ومغرب (جائے طلوع وغروب) میں جا کر سورج کے دونوں جانب کھڑی ہو جاتی ہیں، چوتھا قول یہ ہے کہ قرنین سے شیطان کے دو لشکر مراد ہیں جو بوقت طلوع وغروب لوگوں کو اغوا کرنے پر مامور ہوتے ہیں جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ المفاتیح میں فرمایا ہے:

قِيلَ: الْمُرَادُ بِقَرْنَيِ الشَّيْطَانِ اَحْزَابُه وَاَتْبَاعُهُ، وَقِيلَ قُوَّتُهُ وَغَلَبَتُهُ، اِنْتِشَارَ الْفَسَادِ وَقِيلَ الْقَرْنَانِ نَاحِيَتَا الرَّاسِ، وَهٰذَا هُوَ الاَقْوٰى، يَعْنِي اَنَّهُ يُدْنِي رَاسَهُ اِلَى الشَّمْسِ فِي هٰذِهِ الاَوْقَاتِ فَيَكُونُ السَّاجِدُ لَهَا مِنَ الْكُفَّارِ كَالسَّاجِدِيْنَ لَهُ فِي الصُّوْرَةِ......

مزید تفصیل کے لئے علامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تاویل مختلف الحدیث'' کا مطالعہ کیجئے، انہوں نے اس حدیث کی تشریح وتفصیل بہت ہی سہل انداز میں پیش کی ہے، نیز ہر بات کو مدلّل اور مثالوں سے منطبق کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اس سلسلے میں شروح حدیث کا مطالعہ بھی کافی فائدہ مند رہے گا۔

مکّھی کے پر میں شفا ہے

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنهُ اَنَّهٗ قَالَ: اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ: قَالَ: اِذَا وَقَعَ الذُبَابُ فِی اِنَاءِ اَحَدِکُم فَامْقُلُوْهُ، فَاِنَّ فِی اَحَدِجَنَا حَیْهِ سَمًّا، وَفِی الآخَرِ شِفَاءٌ، وَاِنَّهٗ یُقَدِّمُ السَّمَّ وَیُؤخِّرُ الشِّفَاءَ۔ (ا)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کے برتن میں مکّھی گر جائے تو اس کو پورے طور پر ڈبودو، اس لئے کہ مکّھی کے ایک پر میں زہر ہوتا ہے اور دوسرے پر میں شفاء ہوتی ہے، اور یہ یاد رہے کہ مکّھی زہر والے پر کو پہلے رکھتی ہے اور شفا والے پر کو بعد میں رکھتی ہے۔

اعتراض: مذکورہ روایت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز میں زہر اور

تخریج: اذا وقع الذباب فی اناء احدکم

(ا) اخرجه البخاری: کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب فی شراب احدکم فلیغمسه فان فی احدی جناحیه داء وفی الاخر شفاء، رقم الحدیث: ۳۳۳۲۔ ۵۷۸۲۔

وابوداوٗد، کتاب الاطعمة، باب فی الذباب یقع فی الطعام، رقم الحدیث، ۳۸۴۴۔

والنسائی، باب الذباب یقع فی الاناء، رقم الحدیث، ۴۲۶۷

وابن ماجة: کتاب الطب، باب الذباب یقع فی الاناء، رقم الحدیث، ۵۰۴س ۳۔ ۳۵۰۵۔

واحمد فی المسند، ۲/۲۲۹۔ ۲۶۳۔۔ ۳۴۰۔ ۳۵۵۔ ۳۸۸۔ ۳۹۸۔ ۴۴۳

شفا دونوں چیزیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں نیز مکّھی جو ایک غیر ذوی العقول مخلوق ہے اس کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ زہر والا پَر ہے اس لئے اس کو مقدم رکھو، اور دوسرے پر میں شفا ہے اس لئے اسے موخر ہی رہنے دو۔

لٰہذا روایت مذکورہ میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم امت کو دی ہے۔ وہ عقل کے خلاف ہے؟ اس لئے اس کی ایسی توجیہ پیش کی جائے کہ جس سے جدید طبائع کو تشفی ہو۔

جواب: یہ روایت حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوسعید خدری اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، اور صحاح ودیگر کتب میں متعدد طرق سے مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت ان چند روایات میں سے ایک ہے جو زمانہ قدیم ہی سے مستشرقین کا نشانہ بنی رہی ہیں، اور اس کی صحت سے متعلق قسم قسم کے شبہات ظاہر کئے گئے ہیں، محدثین علماء وفقہاء شارحین کتبِ احادیث اور اسلامی محققین وباحثین کی جانب سے ہر زمانہ میں اس قسم کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ، (وفات ۵۹۷ھ) علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، ان حضرات نے حدیث کی صحت سے متعلق شبہات کے ازالہ کی کامیاب کوشش کی ہے، چنانچہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف ''تاویل مختلف الحدیث'' میں مذکورہ سوال کا بہت ہی مفصَّل جواب موجود ہے، ملاحظہ ہو: اس کتاب کا ص ۳۳۴

لیکن ان حضرات کے جوابات کے علاوہ مکّھی کے سلسلے میں جو جدید سائنسی

تحقیقات سامنے آئی ہیں، اور نئے نئے انکشافات وجود میں آئے ہیں اُن سے حدیثِ ذباب کی صحت کے علاوہ اس کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، ان جدید تحقیقات نے حدیثِ ذباب سے متعلق شکوک وشبہات کے راستے تقریباً بند کردیئے ہیں۔

یہ بات تقریباً ہر شخص کو معلوم ہے کہ مکّھی جب گندگی پر بیٹھی ہے تو بہت سے جراثیم اس کے پروں پر لگ جاتے ہیں، البتہ اس بات میں شک ہے کہ مکّھی میں جراثیم کش دوا بھی ہے یا نہیں، اس سلسلے میں ہم ڈاکٹر محمد کمال اور ڈاکٹر محمد عبدالمنعم کی وہ تحقیق ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے مغربی محققین کی جدید تحقیقات کو سامنے رکھ کر مرتب کی ہے اور وہ مصر کے مشہور پرچہ ''مجلّہ الازہر'' میں ۱۳۷۸ھ میں شائع بھی ہوچکی ہے، یہی تحقیق مولانا حسنین احمد ندوی نے اپنی کتاب ''حضرت ابوہریرہؓ حیات وخدمات'' میں نقل کی ہے۔

''مکّھی کے پیٹ میں ایک طفیلی جنس پرورش پاتا ہے، جو گول خلیہ کی شکل کا ہوتا ہے، یہ پیٹ میں بتدریج بڑھتا ہے اور پھر ایک خاص حد تک بڑھنے کے بعد داخلی دباؤ کے نتیجے میں پھٹتا ہے اور اس کا بیج پتلے مواد کے ساتھ اس پارے کے اندر سے باہر نکلتا ہے یہ مواد مختلف کیمیاوی مادوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنے اندر جراثیم کو ہلاک کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں، اس کی جراثیم کش قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک گرام مواد ایک ہزار لیٹر دودھ کو مختلف طرح کے نقصان دہ جراثیم سے پاک کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

مکّھی چونکہ گندی جگہوں پر بیٹھتی ہے، اس سے مختلف طرح کے جراثیم اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتے ہیں، اور پھر جب یہ کسی کھانے کی چیز پر بیٹھتی ہے، تو اسے

آلودہ کر دیتی ہے، اس لئے کہ مکھی کے پیٹ سے نکلنے والا جراثیم کش مواد ہر وقت نہیں نکلتا، بلکہ داخلی دباؤ کے نتیجے میں نکلتا ہے، جس کے لئے عموماً کچھ وقت درکار ہوتا ہے، اس طرح مکھیاں بیماریوں کو پھیلانے اور اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

مکھی جب کسی جگہ بیٹھتی ہے تو اپنا توازن برقرار رکھنے کے لئے پیٹ کے اس سرے کو اوپر رکھتی ہے، جس میں یہ طفیلی جنس پرورش پاتی ہے، اور اپنا پورا وزن پیروں پر رکھتی ہے، اس طرح پیٹ کے اس حصہ پر دباؤ نہ پڑنے کی وجہ سے اس سے جراثیم کش مواد کے نکلنے کا امکان کم ہوتا ہے، مکھی کے پیروں سے لگے جراثیم عموماً کھانے کی چیزوں کو آلودہ کر دیتے ہیں، اور اس کے استعمال کی صورت میں انسان کے بیمار ہوجانے کا امکان بڑھ جاتا ہے، اس لئے مکھی اگر کھانے کی چیزوں میں گر جائے اور پھر اس کو اس میں ڈبو دیا جائے تو ڈبونے کے اس خارجی دباؤ کے نتیجے میں اس کے پیٹ سے مذکورہ جراثیم کش مواد نکل پڑتا ہے، جو نقصان دہ جراثیم کا خاتمہ کر دیتا ہے''۔

اس طرح یہ حدیث نہ صرف حفظانِ صحت سے متعلق شاندار تعلیمات پر مبنی ہے، اور نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیبانہ وحکیمانہ صلاحیت کو اجاگر کرتی ہے بلکہ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ یہ حدیث بھی من جانب اللہ ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے۔ ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى''۔

اس تحقیق کے علاوہ ایک جدید تحقیق اور ہے جو موجود دور کے ایک مشہور ڈاکٹر نے پیش کی ہے اور ''جمعیۃ البدایہ الاسلامیہ'' میں شائع ہوئی ہے، یہ تحقیق علامہ عبداللہ

القیصی نے بیان کی ہے۔اس کا خلاصہ اس طرح ہے:

''مکّھی گندگی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں پر بیٹھتی ہے جو اُن جراثیم سے بھرے ہوتے ہیں جو طرح طرح کی بیماریوں کو پھیلانے کا باعث بنتے ہیں، ان جراثیم میں سے بعض اس کے پہلوؤں سے چمٹ جاتے ہیں، اور کچھ اس کے پیٹ کے اندر پہنچ جاتے ہیں، اس سے اس کے جسم کے اندر ایک زہریلا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، اس مادہ کا نام اہلِ طب کی اصطلاح میں ''معبد البکتریا'' ہے، لیکن اس مادہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت سی بیماریوں کے جراثیم کو ختم کر دیتا ہے، اور ''معبد البکتریا'' کے موجود ہونے کی صورت میں ان جراثیم کا زندہ رہنا یا انسانی جسم میں کچھ اثر کرنا ناممکن ہوتا ہے، نیز مکّھی کے ایک پَر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ''معبد البکتریا'' کو اس کے پیٹ سے ایک پہلو کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے، لہٰذا مکّھی جب کسی کھانے یا پینے کی چیز پر بیٹھتی ہے تو پہلو سے چمٹے ہوئے جراثیم اس میں ڈالتی ہے تو ''معبد البکتریا'' میں سے جو مادہ قریب ہوتا ہے، ان جراثیم کو فنا کر دیتا ہے، ان جراثیم سے بچانے والی سب سے پہلی چیز وہ ''معبد البکتریا'' ہے، جسے مکّھی اپنے پیٹ میں اپنے ایک پر (Wing) کے پاس اٹھائے ہوئے ہوتی ہے، لہٰذا چمٹے ہوئے زہریلے جراثیم کو ہلاک اور ان کے عمل کو بے کار کرنے کے لئے یہ چیز کافی ہے کہ پوری مکّھی کو کھانے میں ڈبو کر باہر پھینک دیا جائے......اور بس۔

اس کے علاوہ ایک تیسری جدید تحقیق ہے جو انگلستان کے مشہور طبی رسالہ

(Doctorion Experiments) شائع شدہ ۱۹۷۲ء میں ہے:

"مکھی جب سبزیوں اور کھیتوں پر بیٹھتی ہے تو اپنے ساتھ مختلف بیماریوں کے جراثیم اٹھالیتی ہے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ جراثیم مرجاتے ہیں، اوران کا اثر زائل ہوجاتا ہے، اوران کی جگہ مکھی کے پیٹ میں "بکتر یوفاج" ایک مادہ پیدا ہوتا ہے، جو زہریلے جراثیم کوختم کرنے کی خصوصیت رکھتا ہے، اگر تم کسی نمکین پانی میں مکھی کے پیٹ کا مادہ ڈالوتو تمہیں وہ "بکتر یوفاج" مل سکتا ہے، جو مختلف بیماریاں پھیلانے والے چار قسم کے جراثیم کا مہلک ہے ،اس کے علاوہ مکھی کے پیٹ کا یہ مادہ بدل کر "بکتر یوفاج" کے بعد ایک ایسا مادہ بن جائے گا جو چار مزید قسم کے جراثیم کو فنا کرنے کے لئے مفید ثابت ہوگا"۔

(بینات ترجمہ مشکلات الحدیث النبویہ ص ۱۱۸، بحوالہ تفہیم اسلام ص ۴۵۵)

....

علامہ ابن قتیبہؒ نے بھی مستشرقین کی طبائع اوران کے اذہان وفکر کے پیش نظر ایک فلسفیانہ جواب دیا ہے، تتمہ کے طور پران کی عبات نقل کی جاتی ہے:

"وَبَعْدُ! فَمَا يُنْكَرُ مِنْ اَنْ يَكُوْنَ فِيْ الذُّبَابِ سَمٌّ وَشِفَاءٌ إِذَا نَحْنُ تَرَكْنَا طَرِيْقَ الدِّيَانَةِ وَرَجَعْنَا إِلَى الْفَلْسَفَةِ؟

وَهَلِ الذُّبَابُ فِي ذٰلِكَ إِلَّا بِمَنْزِلَةِ الْحَيَّةِ؟ فَاِنَّ الْاَطِبَّاءَ يَذْكُرُوْنَ اَنَّ لَحْمَهَا شِفَاءٌ مِنْ سَمِّهَا إِذَا عَمِلَ مِنْهُ التِّرْيَاقُ الْاَكْبَرُ وَنَافِعٌ مِنْ لَدْغِ الْعَقَارِبِ وَعَضِّ الْكِلَابِ الْكَلِبَةِ، وَالْحُمَّى [1] الرُّبْعِ وَالْفَالِجِ وَاللَّقْوَةِ [2] وَالْاِرْتِعَاشِ وَالصَّرْعِ۔

---

(١) وهي التي تجي في الرابع من الايام فتاخذ يوما وتدع يومين ثم تجيء في الرابع

(٢) اللقوة: داء في الوجه، يشل بعض عضلاته۔

وَكَذٰلِكَ قَالُوْا فِيْ الْعَقْرَبِ: إِنَّهَا إِذَا شَقَّ بَطْنُهَا، ثُمَّ شُدَّتْ عَلَى مَوْضِعِ اللَّسْعَةِ، نَفَعَتْ وَإِذَا أُحْرِقَتْ فَصَارَتْ رِمَادًا ثُمَّ سُقِيَ مِنْهَا مَنْ بِهِ الْحِصَاةُ، نَفَعَتْهُ وَرُبَمَا لُسِعَتِ الْمَفْلُوْجَ فَأَفَاقَ۔

وَتُلْقَى فِي الدُّهْنِ حِينًا فَيَكُوْنُ ذٰلِكَ الدُّهْنُ مُفَرِّقًا لِلْأَوْرَامِ الْغَلِيْظَةِ۔

وَحَكَوْ عَنْ صَاحِبِ الْمَنْطِقِ: قَوْمًا مِنَ الْأُمَمِ كَانُوْا يَأْكُلُوْنَ الذُّبَابَ فَلَا يَرْمَدُوْنَ۔

وَقَالُوْا فِيْ الذُّبَابِ: إِذَا شُدِخَ، وَوُضِعَ على مَوضِعِ لَسْعَةِ الْعَقْرَبِ سَكَنَ الْوَجَعُ"۔

وَهٰذَا يَدُلُّ عَلى طَبِيْعَةٍ فِيْهِ شِفَاءٌ أَوْ سَمٌّ۔[1]

(۱) تاویل مختلف الحدیث ص ۳۳۵

امراض متعدّی نہیں ہوتے

عَنْ اَبِیْ هُرَیرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَاعَدْوٰی وَلَاطِیْرَةَ وَ لَاصَفَرَ، وَلَانَوْءَ، وَفِی رِوَایَةِ جَابِرٍ، وَلَاغُوْلَ۔(۱)

وعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:: فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ فِرَارَكَ مِنَ الْاَسَدِ۔(۲) وَعَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:: اَلشُّوْمُ فِیْ الْمَرْاَةِ، وَالدَّارِ، وَالدَّابَّةِ۔(۳)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اسلام میں ایک کی بیماری دوسرے میں سرایت کرنے کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اور نہ بذات خود ماہِ صفر میں کوئی نحوست ہے، اسلام میں بدشگونی کوئی چیز نہیں، اور نوء کی بھی بذات خود (بارش ہونے یا نہ ہونے میں) کوئی تأثیر نہیں، اور غول کی بھی (تکلیف پہنچانے یا راحت پہنچانے میں) بذات خود کوئی تأثیر اور حقیقت نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مجذوم یعنی کوڑھ کے مریض سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے

---

(۱) رواه البخاری، کتاب الطب رقم الحدیث، ۱۹،۴۳،۴۴

(۲) رواه البخاری: ۱۰۹/۷۔ وسند احمد ۴۴۳/۲۔

(۳) رواه ابوداؤد بلفظ "الشوم فی الدار والمراة والفرس" ۴/ ۳۹۲۲۔

بھاگتے ہو۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بدشگونی تین چیزوں (عورت، گھر، دابہ) میں ہے۔

اعتراض: پہلی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیماریاں متعدی نہیں ہوتیں، یعنی ایک کی بیماری دوسرے میں سرایت نہیں کرتی۔

جبکہ دوسری روایت جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے مروی ہے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجذوم شخص کی مخالطت ومجالست اختیار نہ کرو، بلکہ اس سے دور ہی دور رہو، قریب بھی نہ پھٹکو، جس طرح تم شیر سے دور رہتے ہو تو اعتراض یہ ہوا کہ پہلی روایت میں ہے کہ بیماریاں متعدی نہیں ہوتیں، جبکہ دوسری روایت اس بات کی طرف مشیر ہے کہ بیماریاں خاص طور سے جذام ایک سے دوسرے میں سرایت کر جاتا ہے، اسی لئے تو آپ نے مجذوم شخص کے ساتھ مجالست کو ناپسند فرمایا۔

اعتراض کا دوسرا رخ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی روایت میں "لاَ طِیَرَۃَ فِی الْاِسْلَامِ" "اسلام میں بدشگونی نہیں" فرمایا اور بدشگونی ونحوست اور توہمات کی ساری بنیادوں کو باطل قرار دیا، اور آپ نے انسانیت کو یہ تعلیم دی کہ یہ باطل چیزیں ہیں، زمانۂ جاہلیت کی بری رسمیں اور باطل عقیدے ہیں، اسلام میں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، جبکہ دوسری روایت جو سب سے آخر میں ذکر کی گئی ہے، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بدشگونی کا تصور بعض چیزوں میں پایا جاتا ہے، مثلاً عورت، گھر اور گھوڑا، کہ ان چیزوں میں بدشگونی ہے، لہٰذا یہ روایت پہلی رویات کے بالکل خلاف ہے۔ فَکَیْفَ التَّوجِیْہُ؟

جواب: اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو پوری انسانیت کے لئے ایک جامع لائحہ عمل

ہے،اور یہی وہ مذہب ہے کہ جس پر چل کر انسان دونوں جہانوں میں کامیاب وکامران ہوسکتا ہے، کیونکہ اسلام پوری کائنات کا دین ہے، اس لئے کہ ساری کائنات اوراس کے تمام اجزاء خدا کے مقرر کئے ہوئے قانون کے ماتحت چل رہے ہیں، آدمی جب اسلام کو اختیار کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کی سوچ اسلام کے تحت آتی ہے، اس کے بعد اس کی خواہشات اس کے جذبات، اس کی دلچسپیاں، اس کے تعلقات، اس کی محبت ونفرت، سب خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں، اسلام ہی وہ مذہب ہے کہ جس میں اوہام پرستی، اور باطل توہمات کی کوئی حقیقت نہیں، اسی لئے تو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے "وَلَا طِيَرَةَ" (اسلام میں بدشگونی نہیں،) کہہ کر ان باطل توہمات اور غلط عقائد وخیالات اور تصورات کا قلع قمع کردیا، اور امتِ مسلمہ کو یہ تعلیم دی کہ ان چیزوں میں بذات خود کوئی تأثیر نہیں، حقیقی مؤثر بالذات تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات گرامی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں دسیوں روایات ہیں، نیز اس کے علاوہ متعدد آیات ہیں جن میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے، کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے یا ہوگا، وہ اللہ کی مشیت سے ہوگا، بغیر اذن خداوندی کے کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی، اور کیوں نہ ہو جبکہ اسلام کی بنیاد، اور اسلام کی اساس ہی وحدانیت باری تعالیٰ اور اس کی ربوبیت پر ہے، یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص حلقہ بگوش اسلام ہوتا ہے تو اسے "لا الہ الا اللہ" کہنا پڑتا ہے، دراصل یہ کہہ کر اس سے میثاق واقرار لیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عبادت کے لائق ہے، اسی کی تابعداری وفرمانبرداری کرنی چاہئے، اور اسے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ کرنے والی ذات صرف اور صرف اللہ پاک کی ذات ہے، توہمات اور باطل تصورات کی کوئی حقیقت نہیں، بدشگونیاں وتوہمات، باطل عقیدے ہیں، ان

کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لہٰذا پہلی حدیث میں جن جن چیزوں کے مؤثر بالذات ہونے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تردید فرمائی ہے، یہ ایک حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا، یعنی صحیح بات تو یہ ہے کہ بیماریاں دوسروں کے اندر سرایت نہیں کرتیں، یعنی بیماریوں کے اندر بذات خود کوئی ایسی تاثیر نہیں ہے کہ وہ دوسرے آدمی کو لگ جائیں، جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ بیماریاں (خاص طور پر مجذوم شخص کا جذام) دوسرے انسان میں سرایت کرجاتا ہے، اس لئے زمانۂ جاہلیت میں جب کسی کو یہ بیماری ہوجاتی تو کوئی بھی آدمی اس مجذوم شخص کی عیادت تو کیا؟ دوا پلانے کے لئے قریب جانے سے بھی خوف کھاتا تھا، اور اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا، اس لئے کہ ان کا گمان تھا کہ اگر قریب جائیں گے تو بیماری ہمیں بھی لگ جائے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی باطل عقیدہ کی تردید فرمائی، اور یہ فرمایا "لَا عَـــدْوای"، یعنی بیماریوں میں کوئی تعدیہ نہیں، یعنی کسی بیماری میں بذات خود کوئی ایسی طاقت نہیں کہ دوسرے آدمی کو بھی لگ جائے۔ اگر بیماریاں آپس میں متعدی ہوتیں تو اطباء علاج کیسے کرتے؟ ان کو بھی بیماریاں لاحق ہوجانی چاہئے تھیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اطباء علاج کرتے ہیں، اس بات کو آپ نے بھی عقلی اعتبار سے سمجھایا ہے، اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تعدیہ کوئی چیز نہیں، تو آپ سے عرض کیا گیا کہ "لَا عَـــدْوای" (یعنی بیماری میں تعدیہ کی کوئی حقیقت نہیں) کیسے صحیح ہے؟ جبکہ ایک خارش زدہ اونٹ کو دوسرے صحیح سالم اونٹ کے پاس باندھ دیا جائے، یا بالفاظ دیگر خارش زدہ اونٹ کے ساتھ دوسرے صحیح سالم اونٹ کی مجالست اور مخالطت ہوجائے تو اس کو بھی خارش ہوجاتی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا: فَـمَـنْ اَعْـدٰی الْاَوَّلَ؟ یعنی جب یہی بات ہے تو پہلے کو

بیماری کہاں سے لگی؟ یا پہلے اونٹ نے کس خارش زدہ اونٹ کی مجالست اختیار کی تھی کہ جس کی وجہ سے اس کو بیماری لاحق ہوگئی؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا صاف جواب یہی ہے کہ پہلے کو اللہ نے بیماری دی تھی، یہی حال دوسرے اونٹ کا بھی ہوگا، اس لیے آپ نے فرمایا"لَا عَدْوٰی"، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ روایت پہلی روایت کے بظاہر مخالف ہے، کیونکہ اس کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ" مجذوم آدمی سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو" یعنی مجذوم آدمی کی مجالست اختیار نہ کرو، یا یہ کہ" بیمار آدمی صحیح سالم کے پاس نہ جائے" ان دونوں روایتوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ایک کی بیماری دوسرے کو لاحق ہوجاتی ہے، اور یہ بات پہلی روایت کے خلاف ہے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان روایتوں کے مابین تطبیق کی کیا شکل ہوگی؟

ان روایتوں کے مابین جو بظاہر تعارض ہوا، اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں، چند جوابات میں ان شاء اللہ ذیل میں ذکر کروں گا تا کہ روایتوں کے مابین تطبیق پیدا ہوجائے، اور ہر ایک روایت کا صحیح محمل معلوم ہوجائے:

ا۔ حاشیہ نخبۃ الفکر میں ابن الصلاح وغیرہ کے حوالہ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ "لَا عَدْوٰی" کی حدیث میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ امراض میں بذات خود سرایت کرنے اور اثر انداز ہونے کی صلاحیت نہیں ہے، اور جہاں تک بات رہی "فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ فِرَارَكَ مِنَ الْاَسَدِ" والی روایت تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ یہ امراض سرایت کرنے کے سلسلے میں اسبابِ عادیہ میں سے ہیں، یعنی کبھی کبھار اس قسم کے مریضوں کیساتھ مخالطت ومجالست اختیار کرنے سے یہ امراض بطور عادت سرایت کر جاتے ہیں لیکن کبھی سرایت نہیں بھی کرتے، جیسا

کہ شربِ ماء (پانی پینے سے) سے عادۃً سیرابی ہوجاتی ہے، لیکن کبھی سیرابی کا اثر مختلف ہوجاتا ہے، پھر کتنا ہی پانی کیوں نہ پی لیا جائے مگر اس سے سیرابی نہیں ہوتی، جیسا کہ شیر سے عادۃً لوگ خوف کھا کر بھاگتے ہیں، مگر کبھی بھاگنے کی ضرورت نہیں ہوتی، جبکہ شیر تربیت یافتہ ہو۔

(۲) "لَا عَـدْوَای" والی روایت سے زمانۂ جاہلیت میں بیماری کے جو سرایت کرنے کا اعتقاد تھا اس کی تردید کرنی مقصود ہے، اور "فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ" والی روایت سے فی نفسہ جو بیماری اثر انداز ہوتی ہے اس کا اثبات مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ سرایت کرنے والے امراض سے اگرچہ مرض لاحق ہوجاتا ہے، لیکن اس کو مؤثر نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ یہ بھی مشیت باری تعالیٰ کی وجہ سے ہے، اسی حقیقت کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند نے یوں سمجھایا ہے کہ پانی سے سیرابی ہوتی ہے، لیکن مؤثر پانی نہیں بلکہ اللہ پاک ہے، یہاں بھی جذام میں سرایت کرنے کی تاثیر ہے، مگر مؤثر وہ نہیں بلکہ خدائے تعالیٰ ہے، اب فی نفسہ تاثیر ہونا اور موثر نہ سمجھنا ان دونوں حقیقتوں کو دو الگ الگ حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے، لہٰذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

۳۔ تطبیق کی تیسری شکل یہ ہے کہ "فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ" کا حکم کلی وعام نہیں بلکہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کے لئے ہے اور "لَا عَـدْوَای" کا حکم ان کاملین ومتوکلین کے لئے ہے جن کی نظر بارگاہِ رب العزت کی طرف لگی رہتی ہے، جیسا کہ روایت میں ہے کہ "اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکَلَ مَعَ الْمَجْذُوْمِ وَقَالَ بِسْمِ اللّٰہِ ثِقَۃً وَتَوَکُّلًا عَلَیْہِ"۔ [1]

(۱) حاشیۃ مشکوۃ المصابیح، باب الفال والطیرۃ۔

۴۔حافظ ابن حجرؒ نے اس جواب کو راجح قرار دیا ہے کہ "لَا عَــدْوٰی" میں جو سرایت کی نفی کی گئی ہے وہ اپنے عموم پر باقی ہے، کہ کوئی مرض بالکل سرایت نہیں کرتا، البتہ "فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ" میں جو بھاگنے کا حکم دیا گیا ہے وہ سدِ ذرائع کے قبیل سے ہے، یعنی اگر کسی نے جذامی سے مجالست اختیار کی اور ناگہانی طور پر تقدیر الٰہی سے اس مجالست کرنے والے کو بھی جذام کی بیماری پکڑ لے تو وہ یہ اعتقاد کر بیٹھے گا کہ مجھ کو یہ مرض اس کی مخالطت سے ہوا۔ اور ظاہر ہے یہ اعتقاد باطل ہے، اس باطل عقیدہ کے مادہ کو ختم کرنے کے لئے "فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ" کا حکم دیا گیا۔[1]

اس کے علاوہ اور بھی متعدد توجیہات ہیں جن کو شارحینِ کتبِ حدیث نے بیان کیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ تاویل مختلف الحدیث۔ ص ۴۶۸

(۲) حاشیۃ نخبۃ الفکر ص۴۴، مشکوٰۃ المصابیح ۲/ ۳۹۱۔ حاشیۃ الترمذی ۲/ ۳۷۔ مرقاۃ المصابیح، باب الفال والطیرۃ۔

اسلام میں بدشگونی نہیں ہے

حدیثِ اول پر دوسرا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا "وَلَا طِيَرَةَ فِي الْاِسْلَامِ" اسلام میں بدشگونی نہیں، اور دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدشگونی تین چیزوں میں ہے، عورت، گھوڑے اور گھر میں، لہذا یہ دونوں روایتیں آپس میں مختلف ہیں۔

جواب: اس تناقض واختلاف کا جواب یہ ہے کہ راوی سے ایک لفظ چھوٹ گیا ہے، اگر وہ لفظ پیش نظر ہوتو اس سوال کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں بدشگونی تو ہے ہی نہیں (جیسا کہ وَلَا طِيَرَةَ میں آپ نے ارشاد فرمایا) اگر بدشگونی ہوتی تو عورت، فرس اور گھر میں ہوتی، لیکن چونکہ بدشگونی ان تینوں چیزوں میں بھی نہیں ہے۔لہذا دنیا کی کسی چیز میں بھی بدشگونی نہیں ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ ان روایتوں میں حقیقت میں کوئی تعارض نہیں، سب کا محمل الگ الگ ہے، لہذا جب سب کو اس کے محمل پر رکھ دیا جائے تو اختلافات خود بخود کافور ہوجائیں گے، یا یہ احادیث لوگوں کے مختلف احوال پر محمول ہیں۔

حدیث "اَلشُّوْمُ فِي الْمَرْأَةِ" کے اعتراض کو بعض (منکرین حدیث) نے یوں بیان کیا ہے کہ پہلے تو انہوں نے حدیث نقل کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''تین چیزیں منحوس ہیں، گھوڑا، عورت، اور مکان''، آگے لکھتے ہیں، اس فرمان کا مقصد تو یہی ہوسکتا ہے کہ ''لوگ ان منحوس چیزوں سے بچیں، لیکن لوگ کیسے بچ سکتے

ہیں؟ جب کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھوڑا، گیارہ بیویاں اور نو مکانات اپنے قبضہ میں رکھے تھے، اگر کوئی ہم سے پوچھ بیٹھے کہ کیا یہ قول اسی رسول کا ہے...... جس نے فرمایا تھا کہ ''نکاح میری سنت ہے'' "اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ" (دو اسلام ص ۳۱۳ تا ص ۳۱۴)

اس اعتراض کا ایک جواب تو آ چکا ہے کہ روایات میں ایک لفظ چھوٹ گیا ہے، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو نقل فرمایا ہے۔ "اِنْ كَانَ الشُّوْمُ فِيْ شَيٍّ فَفِي الدَّارِ، وَالْمَرْأَةِ وَالْفَرَسِ"۔ حضرت سہلؓ کی روایت کا بھی یہی مضمون ہے، صرف معمولی الفاظ کا فرق ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

اِنْ كَانَ الشُّوْمُ فِيْ شَيٍّ فَفِي الدَّارِ، وَالْمَرْأَةِ وَالْمَسْكَنِ

(رواہ البخاری)

اگر نحوست کا کوئی وجود ہوتا تو ان تین چیزوں میں بھی ہوتا، گھوڑا، عورت، گھر۔

اس روایت کا شان ورود یہ ہے کہ ایامِ جاہلیت میں لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ فلاں فلاں چیز میں نحوست ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باطل عقیدہ کی تردید ان الفاظ میں کر دی کہ نحوست کا کوئی وجود نہیں، اگر ہوتی تو ان محبوب ترین چیزوں میں بھی ہوتی، جن سے کنارہ کشی ناممکن ہے، کیا نحوست کی وجہ سے ان چیزوں کو چھوڑا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، جب یہ نہیں ہو سکتا تو پھر محض نحوست کے وہم سے دوسری چیزوں کو چھوڑنا لایعنی ہے، یہ ہے حدیثِ رسولِ پاک کا منشا، اسی نحوست والے اعتراض کو بعض نے یوں بیان کیا ہے:

''کیا جن عورتوں نے لاکھوں انبیاء واولیاء پیدا کیے، جن کی گود میں لقمان

وافلاطون...... کھیلے، وہ منحوس ہیں اور ہم مسعود"۔ دو اسلام ص ۳۱۴

اوپر تو یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عورت منحوس نہیں، تاہم اعتراض کے اس پیرایہ بیان میں صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ عبارت محض جذبات کو بھڑکانے کے لئے ہے، اس میں صرف مبالغہ ورنگینی ہے، کیونکہ مذکورہ عبارت کو اس طرح بھی ترتیب دے سکتے ہیں کہ کیا جن عورتوں نے لاکھوں شیطان کے اولیا پیدا کئے، جن کی گود میں فرعون وہامان کھیلے، جنہوں نے کافر، چور، ڈاکو، بدمعاش، رہزن، سفاک، فجار، زانی اور شرابی جیسے لوگوں کو جنم دیا وہ مسعود ہیں؟ کیا جن عورتوں نے ابولہب، ابوجہل اور دیگر اشرار کو اپنے دودھ سے پرورش کیا وہ منحوس نہیں، جن کے بارے میں قرآن نے کہا: اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ۔

بہرحال تحقیقی جواب تو وہی ہے جو اوپر بخاری شریف کے حوالے سے گذرا، یہ تو سوال مذکور کے پیش نظر محض ایک الزامی جواب ہے۔ اور بس......

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلی روایت میں جو الفاظ آئے ہیں ان کی مختصر تحقیق آجائے:

لاعدوی، تعدیہ کی کوئی حقیقت نہیں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

طِیَرَۃَ

بدفالی، فال، ان دونوں لفظوں کی لغوی واصطلاحی تحقیق ملا علی قاری نے شرح مشکوۃ مرقاۃ المفاتیح میں نہایہ کے حوالے سے نقل کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ طیرہ (یعنی فال) خیر وشر دونوں میں مستعمل ہے، اور طیر صرف شر میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے، فال نیک، فال بد، وفی القاموس "اَلْفَالُ ضِدُّ الطِّیَرِ فِیْ غَالِبِ الِاسْتِعْمَالِ" وَالطِّیَرَۃُ لَا یُسْتَعْمَلُ اِلَّا فِیْ الشَّرِّ"۔

فال نیک اختیار کرنا قابل تعریف اور سنت ہے، اور بدفالی لینا ممنوع اور مذموم ہے، جیسا کہ روایت میں ہے:

رَوَی ابْنُ عَبَّاسٍ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "یَتَفَاءَلُ وَلَا یَتَطَیَّرُ وَکَانَ یُحِبُّ الْاِسْمَ الْحَسَنَ"(۱)

طیرۃ سے یہاں مراد یہ ہے کہ اہل عرب کسی کام کے لئے سفر میں جانے کا ارادہ کرتے تو پرندہ کو ان کے گھونسلوں سے اڑواتے، اگر وہ پرندہ دائیں طرف اڑتا تو اس سفر کو مبارک خیال کرتے اور فال نیک لیتے، لیکن اگر وہ بائیں جانب اڑتا تو سفر کو منحوس سمجھ کر سفر سے باز آجاتے اور رک جاتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی باطل عقیدہ کی تردید فرمائی، اور فرمایا "وَلَا طِیَرَۃَ فِی الْاِسْلَامِ" اسلام میں بدشگونی نہیں۔

ھامۃ

۱۔ وہ پرندہ مراد ہے جو عرب کے خیال کے مطابق میت کی ہڈی سے پیدا ہوکر اڑتا ہے، جو نحوست کا باعث ہوتا ہے۔

۲۔ یا مقتول آدمی کے سر سے ایک پرندہ نکلتا ہے جس کا نام ہامہ ہے، جو اس وقت تک یہ فریاد کرتا رہتا ہے مجھے پانی دو، مجھے پانی دو، یہاں تک کہ مقتول کے قاتل کو قتل نہ کیا جائے۔

۳۔ بعض نے کہا ہامہ سے بوم یعنی اُلّو مراد ہے جو کسی کے گھر پر بیٹھ جائے اور کسی کی اس پر نظر پڑ جائے تو وہ اسے نحوست کی علامت سمجھتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باطل توہمات کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا:

"وَلَا ھَامَۃَ فِی الْاِسْلَامِ"۔

(۱) مرقاۃ المفاتیح ۳۲/۹

"ولاصفر،، سے کیا مراد ہے، اس میں متعدد اقوال ہیں:

ا۔محمد بن راشد نے بیان کیا ہے کہ صفر سے محرم الحرام کے بعد والا مہینہ صفر المظفر مراد ہے، جس کو اہل جاہلیت محل نزول بلا وآفات سمجھ کر منحوس خیال کرتے تھے، (یہ باطل عقیدہ موجودہ زمانہ میں بھی بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے کہ ماہ صفر میں شادی وغیرہ کرنے سے رک جاتے ہیں، انکا یہ خیال ہے کہ یہ منحوس مہینہ ہے، شادی کریں گے تو طلاق ہوجائے گی حالانکہ یہ باطل عقیدہ ہے جس سے احتراز بہت ضروری ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لاَصَفَرَ فرما کر اس کی تردید فرمائی۔

۲۔صفر کے سلسلے میں دوسرا قول یہ ہے کہ بعض اہلِ عرب کا خیال تھا کہ آدمی کے پیٹ میں ایک سانپ ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے، جس سے انسان کو تکلیف ہوتی ہے۔

تیسرا قول علامہ ندوی نے بیان کیا ہے جو دوسرے معنی کے قریب قریب ہے ......ان سب باطل عقائد کی تردید فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا"وَلاَصَفَرَ"۔

وَلَا نَوْءَ

جمع اس کی اَنْوَاءُ آتی ہے، اس سے یہ مراد ہے کہ منازل قمر ۲۸ ہیں اہل جاہلیت کا خیال تھا کہ مذکورہ منازل میں سے بعض کے اندر بارش برسانے کی صلاحیت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باطل عقیدہ کی تردید فرمائی۔ اور فرمایا: وَلَا نَوْءَ۔

وَلَا غَوْلَ

جمع غیلان، نہایہ میں غول کا مصداق جن وشیطان کی جنس کو قرار دیا گیا ہے،

اہلِ عرب کا خیال تھا کہ غول مختلف صورتوں میں انسانوں کے سامنے آ کر ان کا راستہ روکتا ہے، اور ان کو بھٹکا دیتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فاسد زعم کی تردید فرمائی ہے۔

توہمات کا خاتمہ

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے توہمات کا خاتمہ فرمایا ہے کہ توہمات ایک باطل چیز ہے اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں، چنانچہ متعدد روایات میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ توہمات و باطل تصور ایک باطل چیز ہے چنانچہ ہم اس بحث کو بخاری شریف کی ایک روایت پر ختم کرتے ہیں، بخاری شریف میں روایت ہے، ایسی روایات دیگر کتب صحاح میں بھی متعدد طرق سے بیان کی گئی ہیں، روایت کا ترجمہ یہ ہے کہ مدنی دور میں ایک بار سورج گرہن کا واقعہ پیش آیا، اتفاق سے اسی دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کم سن صاحبزادے ابرہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی، چونکہ اس زمانہ میں سورج گرہن کے بارے میں ایک عقیدہ یہ تھا کہ بڑے لوگوں کی موت پر سورج گرہن، چاند گرہن پیش آتے ہیں، اس بناء پر لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ آج چونکہ پیغمبر کے صاحبزادہ کی موت واقع ہوئی ہے اس لئے یہ سورج گرہن پیش آیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا تو مسجد بتول میں پہنچے اور لوگوں کو جمع کر کے یہ ارشاد فرمایا کہ: سورج گرہن اور چاند گرہن کسی کی موت پر یا زندگی کی بناء پر واقع نہیں ہوتے بلکہ وہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ پس جب تم سورج گرہن یا چاند گرہن دیکھو تو عبادت کرو، اور اللہ سے دعا کرو، اس کے بعد آپ نے مسجد میں جماعت کیساتھ لمبی نماز ادا کی اور دعا فرمائی۔ (۱)

---

(۱) رواه البخاری، ۱/ کتاب الکسوف، رقم الحدیث (۱۰۴۰)

یہ کوئی سادہ بات نہ تھی، بلکہ یہ ایک انقلابی اعلان تھا، جو تاریخ میں پہلی بار کیا گیا، قدیم زمانہ میں ہزاروں سال سے توہماتی افکار کا غلبہ تھا، انہیں میں سے تعدیہ، ھامۃ، سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں عجیب قسم کے بے بنیاد نظریات رائج تھے، سورج و چاند گرہن کے بارے میں بعض کا یہ خیال تھا کہ آسمان میں ایک بہت بڑا اژدہا ہے، وہ غصہ ہوکر سورج اور چاند کو نگلنے کی کوشش کرتا ہے، اسی سے گرہن واقع ہوتا ہے۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جب کوئی بڑا آدمی مرتا ہے تو اس کے اثر سے سورج اور چاند کو گرہن لگ جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ...... پیغمبر اسلام نے پہلی بار انسانوں کو بتایا کہ سورج گرہن چاند گرہن کا ان توہماتی نظریات سے کوئی تعلق نہیں، وہ صرف فطرت کے مظاہر ہیں، اور وہ معلوم فلکیاتی قوانین کے تحت واقع ہوتے ہیں، اس طرح آپ نے انسانیت کو توہماتی طرز فکر کے دور سے نکالا، اور اس کو سائنسی طرز فکر کے دور میں داخل کر دیا، اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ فطرت کے مظاہر پر سائنسی انداز میں غور وفکر کیا جائے اور فرضی قیاسات کے بجائے حقیقی اسباب کی روشنی میں نظریات قائم کیے جائیں۔

اس انقلابی رہنمائی کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں وہ بیشمار توہمات نہیں پھیلے جو ہزاروں سال سے دنیا میں چلے آرہے تھے، اسی کے نتیجہ میں سب سے پہلے یہ ہوا کہ مسلم سماج حقیقت پسندانہ سماج بنا، اسلام کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ مذہب اسلام توہماتی اجزا سے پاک ہے، اسی خصوصیت نے اہل اسلام کو اس ذہنی پیچیدگی سے پاک کر دیا جس میں پہلے لوگ مبتلا تھے اب ان کو یہ خطرہ نہیں رہا کہ کوئی علمی دریافت ان کے مذہب کو غلط کر دے گی، وہ اس یقین میں جیتے ہیں کہ ہر علمی دریافت اسلام کے مطابق ثابت ہوگی، کیونکہ جو اسلام ہے، وہی فطرت ہے اور جو فطرت ہے وہی اسلام ہے۔

صرف ایک جوتا پہننے کی ممانعت

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، اَنَّهُ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا انْقَطَعَ شِسْعُ نَعْلِ اَحَدِكُمْ فَلَایَمْشِیْ فِیْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ۔

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ: رُبَمَا اِنْقَطَعَ شِسْعُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ فَمَشٰی فِی النَّعْلِ الْوَاحِدَةِ حَتّٰی یَصْلُحَ الْاُخْرٰی۔ (۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب تم میں سے کسی کی چپل (جوتی) ٹوٹ جائے تو ایک نعل میں نہ چلے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بسا اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چپل کا تسمہ ٹوٹ جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نعل واحد ہی میں چلتے جب تک کہ دوسرے کی اصلاح نہ کر لیتے۔

اعتراض: پہلی روایت دوسری روایت کے خلاف ہے، کیونکہ پہلی روایت کا حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی کی چپل کا تسمہ ٹوٹ

(۱) رواہ ابوداؤد، کتاب اللباس، رقم الحدیث: ۱۴ و مسلم: رقم الحدیث: ۶۹۔ ومسند احمد: ۲/۲۴۵۔ ۳/۲۹۳۔

جائے تو ایک چپل میں اس وقت تک نہ چلے جب تک کہ دوسری چپل کو درست نہ کر لے، جبکہ دوسری روایت یہ بتاتی ہے کہ آپ نے چپل کا تسمہ ٹوٹنے کے باوجود بھی دوسرے جوتے کی درستگی کے وقت تک ایک چپل کو پہنا ہے۔

جواب: ا۔ دونوں روایتوں میں حقیقت میں کوئی تعارض ہی نہیں ہے، کیونکہ علم حدیث کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ حدیث قولی و فعلی میں تعارض ہو جائے تو قولی راجح ہوتی ہے۔ اب مذکورہ دونوں روایتوں میں سے پہلی روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے، لہٰذا پہلی روایت راجح ہوگی۔

۲۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ اصل تو پہلی ہی روایت ہے "لَا یَمْشِیْ" کہ ایک چپل میں نہ چلے، اور جہاں تک بات رہی "فَمَشٰی فِی النَّعْلِ الْوَاحِدَةِ" کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کسی ضرورت کی بناء پر تھا۔

۳۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ ایک نعل میں چلنا اگرچہ مکروہ تنزیہی ہے، لیکن فی نفسہ جائز ہے، اسی بیان جواز کے لئے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چپل کا استعمال فرمایا، تاکہ مسلمانوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ ایک نعل کا پہننا کوئی حرام نہیں۔ اور مواہب میں یہ بات نقل کی گئی ہے کہ جو کام امت کے لئے مکروہ تنزیہی ہے، بیان جواز کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس کام کو کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں مکروہ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ اصل جواز کو بیان کر دینا آپ کے بنیادی فرائض میں سے ہے۔ تفصیل دیکھئے۔ مرقاۃ المفاتیح ۸/۱۰۳۔

ایک جواب یہ بھی ہے کہ کسی انسان کے چپل کا ایک تسمہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر اس کو یا تو وہ پھینکتا ہے، یا اس کو اپنے ہاتھ میں لٹکائے رہتا ہے، پھر ایک ہی جوتے میں چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ دوسری چپل کا تسمہ نہ پالے، یہ وہ چیز ہے جو نعلین میں قبیح تصور

کی جاتی ہے، بلکہ ہر اس لباس اور پہننے کی چیز میں اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا جس کو جوڑا جوڑا پہنا جاتا ہے، کہ ایک کو پہنے اور دوسرے کو نہ پہنے، یہ ایک نہایت بھدّی بات معلوم ہوتی ہے، مثلاً کرتا، پائجامہ، کہ پائجامہ پہنے اور کرتہ نہ پہنے، ایسے ہی چادر ہے، اس کو دونوں کندھوں پر رکھ کر لوگ اوڑھتے ہیں، پھر کوئی ایک مونڈھے پر رکھے اور دوسرے پر نہ رکھے بلکہ لٹکائے رکھے، تو یہ بھی ایک قبیح شکل ہوتی ہے۔ علامہ ابن قتیبہ نے اسی جواب کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”لِاَنَّ الرَّجُلَ كَانَ يَنْقَطِعُ شِسْعُ نَعلِهِ، فَيَنْبِذُهَا، اَو يُعَلِّقُهَا بِيَدِهِ وَيَمْشِي فِی نَعْلٍ وَاحِدَةٍ، اِلَى اَنْ يَجِدَ شِسْعًا۔
وَهٰذَا يُفْحَشُ وَيُقَبَّحُ فِي النَّعْلَيْنِ وَالْخُفَّيْنِ، وَكُلِّ زَوْجَيْنِ مِنَ اللِّبَاسِ يُسْتَعْمَلُ فِي اثْنَيْنِ، فَيُسْتَعْمَلُ فِي وَاحِدٍ وَيُتْرَكُ الآخَرُ، وَكَذٰلِكَ الرِّدَاءُ، يُلْقِى عَلٰى اَحَدِ الْمَنْكِبَيْنِ وَيُتْرَكُ الآخَرُ“[1]

پہلی روایت اسی معنی پر محمول ہے اور جہاں تک بات رہی دوسری روایت کی تو یہ روایت اس صورت میں ہے جبکہ کسی کی چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے پھر وہ ایک ہی چپل میں ایک قدم چلے یا دو تین قدم چلے، پھر دوسرا تسمہ اسے مل جائے اور اس کی اصلاح کر کے دوسرے پاؤں میں بھی پہن لے، تو یہ کوئی قبیح اور بھدی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا حدیث کو اپنے اپنے محمل پر رکھ دیا جائے تو اشکال خود بخود ختم ہو جائے گا۔

(۱) تاویل مختلف الحدیث ص ۱۵۰

گرمی کی شدّت جہنّم کی گرمی سے ہے

عَنْ خَبَّابِ بِن الْاَرَتِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ اَنَّہٗ قَالَ: شَکَوْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: شِدَّۃَ الرَّمْضَاءِ فَلَمْ یُشْکِنَا۔

وَعَنْ اَبِی سَعِیدِ الْخُدرِیّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ اَنَّہٗ قَالَ: اَبْرِدُوْا بِالصَّلٰوۃِ: فَاِنَّ شِدَّۃَ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَھَنَّمَ"۔[1]

ترجمہ: حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،فرماتے ہیں کہ ہم نے دھوپ کی شدت کی شکایت کی تو آپ نے ہمیں جواب نہیں دیا۔

یعنی صحابہ کرامؓ نے شدت حرارت کی شکایت کی اور نماز میں ابراد کا مطالبہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاخیر کا حکم نہیں دیا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ،فرماتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: نماز کو ٹھنڈا

---

(۱)رواہ مسلم عن خباب، کتاب المساجد، باب استحباب تقدیم الظھر اول الوقت فی غیر شدۃ الحر، رقم الحدیث۔ ۱۴۰۵۔۱۴۰۶

والنسائی عنہ، کتاب المواقیت، باب اول وقت الظھر، رقم الحدیث۔ ۴۹۸

وابن ماجہ عن ابن مسعود، کتاب الصلوۃ، باب وقت صلوۃ الظھر رقم الحدیث۔ ۶۷۶۔ عن خباب، ۶۷۵۔

واحمد، عن خباب، ۱۴۶/۵۔ رقم الحدیث ۲۱۰۴۳۔۲۱۰۵۳

کر کے پڑھو، اس لئے کہ شدت حرارت جہنم کی گرمی میں سے ہے۔

اعتراض: مذکورہ دونوں روایتیں آپس میں متعارض ہیں کہ پہلی روایت میں ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے نمازِ ظہر میں گرمی کی شدت کی وجہ سے تاخیر کی اجازت مانگی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاخیر کا حکم نہیں دیا، جبکہ دوسری روایت جس کے راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں اس میں ہے کہ آپ نے ابراد صلوۃ کا حکم دیا، اور علت یہ بیان فرمائی کہ شدت حرارت جہنم کی گرمی میں سے ہے، اعتراض کے اس رخ میں دونوں روایتیں بظاہر متعارض ہیں، اعتراض کا دوسرا رخ یہ ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حرارت کی علت فیح جہنم ہے، جبکہ دانشوروں، مفکرین اور علم ہیئت کے ماہرین کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں گرمی وسردی آفتاب کے قرب وبعد کی بنیاد پر ہوتی ہے، لہٰذا بظاہر یہ روایت علم ہیئت کے خلاف ہے۔

جواب: رہی بات پہلے سوال کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں حدیث خباب اور حدیث ابوسعید خدری میں کوئی تعارض ہی نہیں، کیونکہ اول وقت میں نماز پڑھنا اللہ کی رضا وخوشنودی ہے، اور آخری اوقات میں نماز پڑھنے سے اللہ کی معافی شامل حال رہتی ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ عفو ودرگذر کا معاملہ کوتاہی کی وجہ سے ہی ہوتا ہے، نیز اول وقت میں نماز کی بہت زیادہ تاکید آئی ہے، بلکہ آخری وقت میں نماز پڑھنا رخصت ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنے لئے اعلیٰ امور کو چھوڑ کر ادنی امور کو پسند فرمائیں، حالانکہ اعلیٰ امور کو اختیار کرنا تقرب الی اللہ کا باعث ہے، اور رہی یہ بات کہ آپ نے کبھی ادنی امور پر بھی عمل کیا، تو یہ

تعلیمِ امت کی خاطر تھا، بیان جواز کے لئے تھا، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ بھی جائز نہیں کہ آپ ہمیشہ آسان امر پر عمل کرتے رہیں اوراوکد وافضل امر کوچھوڑتے رہیں، پہلی روایت اول وقت پر محمول ہے، اور دوسری روایت رخصت پر، جس وقت صحابہ کرام نے شدت حرارت کی شکایت کی اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی کے ساتھ تھے، اس لئے آپ نے تاخیر کا حکم نہیں دیا، پھر بعد میں آپ نے ابراد کا حکم دیا ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ نہیں تھے، اور یہ امت پر آسانی کے لئے کیا، ابن قتیبہ نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

"لِاَنَّ اَوَّلَ الْاَوْقَاتِ رِضْوَانُ اللّٰهِ، وَآخِرُ الْاَوْقَاتِ عَفْوُ اللّٰهِ، وَالْعَفْوُ لَا يَكُوْنُ اِلَّا عَنْ تَقْصِيْرٍ، فَاَوَّلُ الْاَوْقَاتِ اَوْكَدُ اَمْرًا، وَآخِرُهَا رُخْصَةٌ وَلَيْسَ يَجُوْزُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَأْخُذَ فِيْ نَفْسِهٖ اِلَّا بِاَعْلَى الْاُمُوْرِ، وَاَقْرَبِهَا اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى۔

وَاِنَّمَا يَعْمَلُ فِيْ نَفْسِهٖ بِالرُّخْصَةِ مَرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ، لِيَدُلَّ بِذٰلِكَ النَّاسَ عَلٰى جَوَازِهَا۔

فَاَمَّا اَنْ يَدُوْمَ عَلَى الْاَمْرِ الْاَخَسِّ، وَيَتْرُكَ الْاَوْكَدَ وَالْاَفْضَلَ، فَذٰلِكَ مَالَا يَجُوْزُ فَلَمَّا شَكٰى اِلَيْهِ اَصْحَابُهُ الَّذِيْنَ يُصَلُّوْنَ مَعَهُ الرَّمْضَاءَ، وَاَرَادُوْا مِنْهُ التَّاخِيْرَ، اِلٰى اَنْ يَّسْكُنَ الْحَرُّ، لَمْ يُجِبْهُمْ اِلٰى ذٰلِكَ، اِذَا كَانُوْا مَعَهُ"۔

ثُمَّ اَمَرَ بِالْاِبْرَادِ مَنْ لَمْ يَحْضُرْهُ، تَوْسِعَةً عَلٰى اُمَّتِهٖ وَتَسْهِيْلًا عَلَيْهِمْ۔

جہاں تک بات رہی دوسرے سوال کی تو اس کے متعدد جوابات کتب حدیث

میں دیئے گئے ہیں، اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: بذل المجهود، وفتح الملہم،
ان میں سے چند جوابات یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔ حرارت کا معدن ومنبع تو جہنم ہی ہے، لیکن آفتاب جہنم سے حرارت اخذ کرتا ہے، پھر دنیوی اشیاء آفتاب سے حرارت کو اپنی استعداد اور موانع کے نہ ہونے کے اعتبار سے کم وبیش حاصل کرتی ہیں۔ یعنی جس چیز میں جس قدر استعداد ہے، اسی درجہ کی حرارت اخذ کرتی ہے، گویا آفتاب جہنم اور زمین کے درمیان آتشی آئینہ کی طرح ہے، کہ جہنم سے حرارت کو جذب کر کے دنیا پر اس حرارت کو پھیلاتا ہے، لیکن چونکہ اہل ہیئت کی نظر صرف محسوسات تک محدود ہے، اور وہ اسی کو کمال تصور کرتے ہیں، اس لئے حرارت کی نسبت آفتاب کی طرف کرتے ہیں، جبکہ انبیاء کرام کی نظر ہر شی کی اصل پر ہوتی ہے۔ اس لئے آفتاب جس جہنم سے حرارت لیتا ہے، اسی جہنم کی طرف حرارت کی نسبت کردی، اس توجیہ کے پیش نظر سائنسدان اور اہل ہیئت کے اقوال اور حدیث رسول کے درمیان کوئی تعارض نہ رہا، بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

۲۔ حدیث اپنے ظاہری معنیٰ پر محمول ہے کہ حرارت فیح جہنم ہی کی وجہ سے ہوتی ہے اس کی کیفیت ہم کو معلوم نہیں۔

۳۔ یہ فیح جہنم سے حقیقت میں گرمی ہوتی ہے آپ کا مقصد یہ بتانا نہیں ہے بلکہ آپ کا یہ فرمانا مجاز وتشبیہ کے قبیل سے ہے، یعنی دنیا کی حرارت میں چونکہ جہنم کی حرارت کی شان ہے، اس لئے اس وقت نماز مت پڑھو، تو ممانعت عن الصلوۃ کے لئے دنیا کی گرمی کو نار جہنم سے تشبیہ دینا مقصود ہے۔ (۱)

---

(۱) فتح الملہم ۲/۱۹۸۔ تاویل مختلف ۱۲۴۔

اس وقت نماز پڑھنے سے روکنے میں حکمت کیا ہے، اس کی تفصیلی بحث تو فتح الملہم میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے بیان کی ہے۔ اس میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ:

چونکہ اس وقت مشقت حرارت کی وجہ سے نماز میں حضور قلبی نہ ہوگا، اس لئے منع کیا گیا، دوسری حکمت یہ ہے کہ چونکہ یہ عذاب وغضب کا وقت ہے جیسا کہ مسلم شریف میں روایت ہے، راوی حضرت عمرؓ اور ابن عتبہ رضی اللہ عنہ ہیں:

قَالَ النَّبِیُّ صَلَی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَہٗ اَقْصِرُوْا عَنِ الصَّلٰوۃِ عَنَّا اِسْتِوَاءَ الشَّمْسِ، فَاِنَّھَا سَاعَۃٌ تُسْجَرُ فِیْھَا جَھَنَّمُ۔

تو چونکہ یہ وقت وقت غضب ہے اس لئے ایسے وقت میں نماز پڑھنے سے آپ نے منع فرمایا۔

یہاں پر ایک طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نماز تو سبب رحمت ہے۔ اس سے تو عذاب ختم ہو جاتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک صلوۃ کا کیوں حکم دیا۔

اس سوال کا جواب ابوالفتح العمری نے ان لفظوں میں دیا ہے:

"بِاَنَّ التَّعْلِیْلَ اِذَا جَاءَ مِنْ جِھَۃِ الشَّارِعِ، وَجَبَ قُبُوْلُہٗ وَاِنْ لَّمْ یُفْھَمْ مَعْنَاہُ"۔

چونکہ یہ توجیہ شارع علیہ السلام کی جانب سے آئی ہے اس لئے اس کا قبول کرنا ضروری ہے گرچہ اس کا معنی سمجھ میں نہ آئے۔

لہٰذا یہاں جب شدت حرارت کو ترک صلوۃ کی علت قرار دیا گیا تو اس علت کو قبول کرنا چاہئے، خواہ اس کا معنیٰ ومراد سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس سوال کے جواب کو فتح الملہم میں نہایت ہی واضح انداز میں مثالوں کے ذریعہ بیان کیا ہے۔

دیکھئے فتح الملہم ۲/۱۹۸۔ باب مواقیت الصلوۃ۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات پر عرش کا ہلنا

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنهُ اَنَّهُ قَالَ: سَمِعتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: اِهتَزَّ العَرشُ لِمَوتِ سَعدِ بْنِ مُعَاذٍ۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ: اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ: لَقَدْ اِهْتَزَّ لِمَوْتِهِ الْعَرْشُ وَلَقَدْ تَبَادَرَ اِلٰى غُسْلِهِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ وَمَاكِدْتُ اَصِلُ اِلٰى جَنَازَتِهِ۔[1]

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ لِلْقَبَرِ ضَغْطَةً،وَلَوْكَانَ اَحَدُنَا مِنْهَا نَجَا لَنَجَا مِنْهَا سَعْدُ بْنُ مُعَاذٍ، وَلَقَدْ ضُغِطَ ضَغْطَةً اِخْتَلَفَتْ لَهَا اَضْلَاعُهُ۔[2]

---

(۱) رواه البخاری، مناقب الانصار، مناقب سعد بن معاذ رقم الحدیث، ۳۰۸۳۔

رواه مسلم، کتاب فضائل الصحابه، باب فضائل سعد بن معاذ رقم الحدیث۔ ۶۴۳۶۔ ۶۴۳۶۔ ۶۴۳۷

والترمذی، کتاب المناقب،باب مناقب سعد بن معاذ، رقم الحدیث ۳۸۴۸۔

وابن ماجة: مقدمة، فضل سعد بن معاذ، رقم الحدیث، ۱۵۸۔

رواه مسلم، کتاب فضائل الصحابه، باب فضائل سعد بن معاذ رقم الحدیث۔ ۶۴۳۶۔ ۶۴۳۶۔ ۶۴۳۷۔ مسند احمد، ۲/۳۰۹۵۔ رقم الحدیث ۱۴۳۴۸۔

(۲) رواه احمد فی مسنده: ۶/۵۵۔ ۹۸۔

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا: سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی موت کی وجہ سے عرش رحمٰن ہل گیا، دوسری سند میں یہ ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کی وجہ سے عرش ہل گیا، اور ستر ہزار فرشتے ان کو غسل دینے کے لئے تشریف لائے۔ (فرشتوں کے ازدحام) کی وجہ سے قریب تھا کہ میں جنازہ تک نہ پہنچ پاتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک قبر بھینچتی اور دبوچتی ہے، اگر کوئی اس سے نجات پاتا تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ پاتے، لیکن قبر نے ان کو بھی بھینچ لیا، حتیٰ کہ ایک ہڈی دوسری ہڈی میں گھس گئی۔

اعتراض: عرش رحمٰن جس کی ایک شان ہے، جس کی عظمت واہمیت مسلّم ہے، عرش رحمٰن کے متعلق جو تصریحات قرآن واحادیث میں آئی ہیں انہیں بلا چون وچرا تسلیم کرنا چاہئے، اور ان میں قیل وقال سے گریز کرنا چاہیے، جیسا کہ جب حضرت امام مالکؒ سے کسی شخص نے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کا مطلب دریافت کیا، تو آپ نے تھوڑی دیر توقف کے بعد فرمایا:

"اَلِاسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ، وَالْاِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ، وَالسُّوَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ"۔

لیکن لوگوں نے اس میں قیل وقال کرنا شروع کیا، اور کہا کہ عرش رحمٰن جب ساتوں آسمان وزمین کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے، تو ایسی عظیم چیز میں کیونکر حرکت ہوسکتی ہے، اگر عرش رحمٰن کسی کی موت کی وجہ سے حرکت میں آتا تو سب سے

پہلے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی موت سے حرکت میں آتا، لیکن وہ کسی نبی حتی کہ سید المرسلین وخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے بھی حرکت میں نہیں آیا تو پھر سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کی وفات پر رحمٰن کا عرش حرکت میں آ گیا، اعتراض کا اہم پہلو یہی ہے کہ:

كَيْفَ يَتَحَرَّكُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ لِمَوْتِ اَحَدٍ؟ وَاِنْ كَانَ هٰذَا جَائِزًا فَالْاَنْبِيَاءُ اَوْلٰى بِهٖ۔

اعتراض کا دوسرا رخ یہ ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی عظمت وقدر ومنزلت اتنی کہ ستر ہزار فرشتوں نے ان کو غسل دیا، اور فرشتوں کی اتنی تعداد تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قریب تھا کہ میں جنازہ تک نہ پہنچ پاتا، جیسا کہ روایتِ مذکور ہے، جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ سعد بن معاذؓ قبر کے ضغطہ (دبوچنے، بھینچنے) سے نہ بچ سکے حتی کہ ان کی پسلیاں آپس میں مل گئیں، تو سوال یہ ہے کہ ایک طرف تو ان کی بزرگی کا یہ عالم ہے کہ ستر ہزار نوری مخلوق (فرشتے) ان کو غسل دے رہے ہیں، اور دوسری طرف ان کی بے چارگی ومجبوری وبیکسی کا یہ عالم ہے کہ عذاب قبر سے ان کی پسلیاں ایک دوسرے میں مل گئیں، بظاہر ان دونوں روایتوں میں تعارض معلوم ہو رہا ہے، کوئی ایسی توجیہ پیش کی جائے جس سے روشن خیال طبائع کو تشفی ہو، اور روایتوں کا صحیح محمل متعین ہو جائے۔

جواب: پہلے سوال کے جواب میں مختلف محققینِ حدیث نے متعدد جوابات دیئے ہیں، ان میں سے صرف دو کا تذکرہ کیا جاتا ہے، لیکن اس سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ معترضین کو جو اعتراض ہوا اس کی بنیاد کیا ہے؟ اگر ہم ان کی ذہنیت کو سامنے رکھیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے ''عرش رحمٰن کے ہلنے'' سے مراد حرکت لی

ہے، جیسا کہ نیزہ ہلتا ہے، اور جس طرح ہوا کے جھونکے سے درخت کے پتے اور خود درخت اور پودے ہلتے ہیں، اگر اہتزاز من العرش سے یہی مطلب لیا جائے تو حقیقۃً یہی سوال ہوگا، اور ان کی حجت تام ہوجائے گی، جن روایتوں سے انہوں احتجاج کیا ہے جیسا کہ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ:

فَذَهَبُوا فِيهِ: إِلَى أَنَّ الِاهْتِزَازَ مِنَ الْعَرْشِ إِنَّمَا هُوَ الْحَرْكَةُ، كَمَا يَهْتَزُّ الرُّمْحُ، وَكَمَا تَهْتَزُّ الشَّجَرَةُ، إِذَا حَرَّكَتْهَا الرِّيحُ فَإِذَا كَانَ التَّأْوِيلُ عَلَى هٰذَا وَقَعَتِ الشَّنَاعَةُ وَوَجَبَتِ الْحُجَّةُ الَّتِي احْتَجَّ بِهَا هٰؤُلَاءِ (۱)

چنانچہ بعض حضرات نے سوال کو تسلیم کرنے کے بعد یہ جواب دیا ہے کہ عرش سے مراد وہ چارپائی ہے جس پر سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اٹھایا گیا تھا، وہی چارپائی ہل رہی تھی، اسی کو حضور نے بیان کیا: لَقَدْ اِهْتَزَّ لِمَوْتِهِ (اَیْ سَعْد) الْعَرْشُ۔ (۲)

لیکن یہ ایک تاویل بارد ہے، اور ایک نہایت ہی رکیک توجیہ ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ اگر اس تاویل کو مان لیا جائے تو اس میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (جو ایک جلیل القدر صحابی تھے، جن کی عظمتِ شان میں بخاری شریف میں مستقل ایک باب ہے) کی کوئی فضیلت و بزرگی باقی نہیں رہتی، اور نیز اس کلام کا کوئی فائدہ بھی نہیں، کیونکہ مردے کی چارپائی کا ہلنا تو بہرحال ضروری ہے، کیونکہ لوگ میت کو کندھا دینے کے لئے کھینچا تانی تو کرتے ہی ہیں، لہٰذا سعد بن

---

(۱) تاویل مختلف الحدیث، ص ۳۲

(۲) المصدر السابق

معاذ رضی اللہ عنہ کی چارپائی اگر ہلی تو اس میں ان کی کیا خصوصیت اور کیا عظمت وبزرگی ہوئی؟

نیز نقلی اعتبار سے بھی ''عرش'' سے مردہے کی چارپائی لینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ترمذی شریف وبخاری شریف کی روایت سے عرش کی تعیین ہوجاتی ہے، اس میں صاف طور پر یہ لفظ موجود ہے: اِهْتَزَّ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ لِمَوْتِهِ''[1]

لہٰذا اصل جواب یہ ہے کہ اِهْتِزَازُ مِنَ الْعَرْشِ سے نہ تو حرکت مراد ہے جیسا کہ معترضین کے اعتراض کی بنیاد ہے، اور نہ عرش کا وہ معنیٰ مراد ہے، جو دوسرے بعض نے بیان کیا ہے، اہتزاز سے استبشار وسرور مراد ہے، جیسا کہ عربی میں محاورہ ہے ''اِنَّ فُلَانًا لَيَهْتَزُّ لِلْمَعْرُوْفِ'' فلاں آدمی معروف وبھلائی کی وجہ سے خوشی ومسرت سے جھوم جاتا ہے، اسی طرح اس کے ہم معنی ایک دوسرا مقولہ ہے ''اِنَّ فُلَانًا اِذَا دُعِيَ اِهْتَزَّ وَاِذَا سُئِلَ اِرْتَزَّ'' یعنی جب فلاں کو دعوت دی جاتی ہے تو خوشی وفرحت سے جھومنے لگتا ہے، اور جب اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، تو بخل کرتا ہے، منہ بنالیتا ہے، عربی زبان میں اس قسم کی تعبیرات کثرت سے استعمال ہوتی ہیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ اھتز از کا معنی استبشار وسرور ہے نہ کہ یہ اہتزاز عرش رحمٰن کا ہے، یہی معنی (یعنی استبشار وسرور) حدیث میں مقصود ہے۔

اور جہاں تک بات رہی کہ عرش سے کیا مراد ہے، تو اس کا جوب یہ ہے کہ عرش سے مراد ''عرش الرحمٰن'' ہی ہے، جیسا کہ حدیث میں عرش الرحمٰن کی صراحت آئی ہے، اب اہتزاز العرش کا مطلب ہوا: اِسْتِبْشَارُ الْمَلَائِكَةِ الَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَهُ وَيَحُفُّوْنَ حَوْلَهُ بِرُوْحِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ یعنی ان فرشتوں کا خوش ہونا جو عرش رحمٰن کو اٹھائے

(۱) رواه البخاري ۵۳۶/۱۔ كتاب مناقب الانصار، باب مناقب سعد بن معاذ۔

ہوئے ہیں، اور اس کو گھیرے ہوئے ہیں، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی روح کی وجہ سے، تو گویا یہاں پر عرش کو قائم مقام کر دیا ان لوگوں کے جو اس کو اٹھائے ہوئے تھے یعنی فرشتے، اس طرح کا استعمال قرآن میں بھی ہے۔ مثلاً "فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ"۔[1]

پھر نہ تو ان پر آسمان و زمین کو رونا آیا۔

يُرِيدُ مَا بَكَى عَلَيْهِمْ اَهْلُ السَّمَاءِ وَلَا اَهْلُ الْاَرْضِ ۔

ایسے ہی دوسری جگہ ہے، چونکہ وہ نہایت مبغوض تھے اس لئے ان کی ہلاکت وتباہی پر نہ زمین والے کو رونا آیا اور نہ آسمان والے کو رونا آیا۔

أَيْ سَلْ اَهْلَ الْقَرْيَةِ

ترجمہ: اور پوچھ لے بستی سے یعنی اس بستی والوں سے پوچھ لیجئے۔

جیسا کہ ایک روایت میں یہ بھی ہے:

كَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي اُحُدَ: "هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ۔

اسی طریقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان احد پہاڑ کے سلسلے میں کہ یہ پہاڑ ہے، یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

يُرِيدُ: يُحِبُّنَا اَهْلُهُ يَعْنِي الْاَنْصَارَ وَنُحِبُّهُ، يَعْنِي نُحِبُّ اَهْلَهُ كَذٰلِكَ۔

مراد یہ ہے کہ انصار ہم سے محبت کرتے ہیں اور ہم انصار سے محبت کرتے ہیں۔

اَقَامَ الْعَرْشَ مَقَامَ حَمَلَتِهِ وَالْحَافِّيْنَ مِنْ حَوْلِهِ خلاصہ یہ معلوم ہوا کہ اس طرح عرش کو اس کے اٹھانے والے اور اس کے اردگرد گھیرے ہوئے فرشتوں کے

---

(۱) سورۃ الدخان: ۲۹، یوسف: ۸۲

قائم مقام کردیا، اھتز ازعرش سے ان فرشتوں کا خوش ہونا مراد ہے جوعرش کے اٹھانے پر مامور ہیں، لیکن فرشتوں کوحذف کرکے ان کی جگہ عرش کوان کے قائم مقام کردیا، جیسا کہ مذکورہ عبارتوں میں بھی یہی معاملہ ہے، کہ مضاف کوحذف کرکے مضاف الیہ کواس کے قائم مقام کردیا گیا ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا ملائکہ مومنین کی روح سے خوش ہوتے ہیں، اور ہرمومن کے لئے آسمان میں ایک دروازہ ہوتا ہے، جس سے اس کا عمل اوپر چڑھتا ہے، اوراسی سے اس کی روزی نیچے اترتی ہے، اور جب اس دنیا سے اس کی روح پرواز کرتی ہے، اسی کے ذریعہ اس کی روح اوپر چڑھتی ہے، پھراسی ذریعہ سے روح کو لوٹا دیا جاتا ہے۔عبارت ملاحظہ فرمایئے:

إِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَسْتَبْشِرِيْنَ بِرُوْحِ الْمُوْمِنِ وَإِنَّ لِكُلِّ مُوْمِنٍ بَابًا فِيْ السَّمَاءِ يَصْعَدُ فِيْهِ عَمَلُهُ وَيَنْزِلُ مِنْهُ رِزْقُهُ وَيَخْرُجُ فِيْهِ بِرُوْحِهِ إِذَا مَاتَ ثُمَّ يَرْجِعُ۔ (١)

اس روایت سے جواب مذکورکی مزید وضاحت ہوگئی، اوراسی سے، "لَقَدْ تَبَادَرَ إِلٰى غُسْلِهِ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ" کی بھی توجیہ بھی سمجھ میں آگئی، اور یہ توجیہ بہت ہی سہل اورآسان ہے، اس روایت اور مذکورہ تشریح کا حاصل صرف اتنا ہے کہ حاملین عرش اوراس کے اردگرد رہنے والے فرشتے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی روح سے خوش ہوگئے:

كَأَنَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَقَدْ إِسْتَبْشَرَ حَمَلَةُ

---

(١) رواه الترمذي: رقم الحديث ٣٢٥٥۔ عن انس ابن مالك۔

الْعَرْشِ وَالْمَلَائِكَةُ حَوْلَهُ بِرُوحِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ۔[1]

اب رہا سوال سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو قبر کا عذاب کیوں ہوا؟ حالانکہ دوسری طرف یہ بیان کیا گیا: ''وَلَقَدْ تَبَادَرَ إِلَى غُسْلِهِ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ'' تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موت، بعث اور قیامت کی خوفنا کی وہولنا کی کا یہ عالم ہوگا کہ کوئی ولی بھی اس کی خوفنا کی سے محفوظ نہیں رہ پائے گا، یہی تو وجہ تھی کہ سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے، اور یہ قیامت ہی کی تو شدت کی بات ہے کہ جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے وہ بھی روز محشر میں حساب وکتاب سے ڈرتے ہوں گے، اور یارب نفسی نفسی ہر ایک کی زبان پر ہوگا۔ پوری انسانیت پریشانی و بے قراری کے عالم میں ہوگی، لہٰذا اگر سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو عذاب قبر ہوا تو اس میں حیرت واستعجاب کی کیا بات ہے، کیونکہ عذاب قبر سے سب نے پناہ مانگی ہے۔ ابن قتیبہ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَأَمَّا قَوْلُهُمْ كَيْفَ يُعَذَّبُ مَنْ يَتَبَادَرُ إِلَى غُسْلِهِ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ فَإِنَّ لِلْمَوْتِ وَلِلْبَعْثِ وَالْقِيَامَةِ زَلَازِلَ شِدَادًا، وَأَهْوَالًا، لَا يَسْلِمُ مِنْهَا نَبِيٌّ وَلَا وَلِيٌّ، يَدُلُّكَ إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَتَعَوَّذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ''[2]

وَأَيْضًا يَدُلُّكَ قَوْلُ الْأَنْبِيَاءِ صَلَوَاتُ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ: يَا رَبِّ نَفْسِي وَقَوْلُ نَبِيِّنَا: يَا رَبِّ أُمَّتِي أُمَّتِي۔[3]

---

(۱) تاویل مختلف الحدیث ص: ۳۲۲

(۲) تاویل مختلف الحدیث ص ۳۲۲

(۳) رواہ الترمذی باب احوال القیامۃ۔ ومسلم، کتاب الایمان، رقم الحدیث ۳۲۶۔۳۲۷

اونٹ کے باڑے میں نماز پڑھنے کی ممانعت اور بکری کے باڑے میں نماز پڑھنے کی اجازت

عَنْ اَبِیْ هُرَیرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهُ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلُّوْا فِیْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ وَلَا تُصَلُّوا فِی اَعْطَانِ الْاِبِلِ (۱)

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهُ قَالَ: سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الصَّلٰوةِ فِیْ مَبَارِكِ الْاِبِلِ فَقَالَ: لَا تُصَلُّوْا فِی مَبَارِكِ الْاِبِلِ فَاِنَّهَا مِنَ الشَّیَاطِیْنِ وَسُئِلَ عَنِ الصَّلٰوةِ فِیْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ، فَقَالَ: صَلُّوْا فِیْهَا فَاِنَّهَا بَرَکَةٌ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھو، اور اونٹ کے بارے میں (بتھان میں) نماز نہ پڑھو۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: کہ آپ صلی

---

(۱)رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ کتاب الصلوۃ، باب ماجاء فی الصلوۃ فی مرابض الغنم واعطان الابل، رقم الحدیث ۳۴۸/

رواہ ابوداود عن البرا بن عازب، کتاب الصلوۃ،باب النھی عن الصلوۃ فی مبارک الابل رقم الحدیث ۔ ۴۹۳

رواہ احمد ۵۷/۵۔ رقم الحدیث ۲۰۵۲۱ ۔۲۰۵۲۱ ۔ ۲۰۵۲۱

اخرجہ ابو داؤد ۱/ ۷۰۔ باب النھی عن الصلوۃ فی مبارک الابل۔

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اونٹ کے بیٹھنے کی جگہ میں نماز مت پڑھو، اس لئے کہ وہ شیاطین سے پیدا کئے گئے ہیں، (جب آپ سے اونٹ کے باڑے میں نماز پڑھنے کے سلسلہ میں دریافت کیا گیا) اور جب آپ سے بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے سے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ سکتے ہو۔

اعتراض: روایتِ مذکور پر مستشرقین کا اعتراض یہ ہے کہ پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ روایت میں امت کو نماز پڑھنے کی جگہ سے متعلق ایک بلکہ دو ادب کی تعلیم دی ہے:

۱۔"صَلُّوْا فِـیْ مَـرَابِضِ الْغَنَمِ" بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

۲۔ "لَا تُـصَـلُّـوْا فِی مَبَارِكِ الْاِبِـلِ" اونٹ کے بیٹھنے کی جگہ نماز نہیں پڑھی جاسکتی، اس کی علت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ: "لِاَنَّهَـا مِـنَ الشَّيَـاطِيْنِ" پہلی دو باتیں بالکل صحیح ہیں، اس میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن دوسری بات کی جو علت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہے وہ علت (ممانعت عن الصلوۃ فی مبارک الابل) قابل اعتراض ہے، کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ گائے گائے سے پیدا ہوتی ہے، بکری بکری سے پیدا ہوتی ہے، علی ھذا القیاس، اونٹ اونٹ سے پیدا ہوگا، جیسا کہ انسان انسان سے پیدا ہوتا ہے، پھر آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ اونٹ شیاطین سے پیدا ہوتے ہیں، یہ بات تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے، اور ہماری عقل کے بھی خلاف ہے۔

(۱) تاویل مختلف الحدیث ص ۲۰۴۔

علامہ ابن قتیبہؒ اور علامہ شوکانیؒ نے بھی مستشرقین کے حوالے سے اس سوال کو نقل کیا ہے، عبارت دیکھئے:

"یَعْلَمُ کُلُّ مَنْ لَہُ اَدْنٰی اِلْمَامٌ بِالْعِلْمِ وَالْمَعْرِفَۃِ اَنَّ الْاِبِلَ خُلِقَتْ مِنَ الْاِبِلِ، کَمَا اَنَّ الْبَقَرَ، مِنَ الْبَقَرِ وَالْخَیْلَ مِنَ الْخَیْلِ، وَالْاَسَدَ مِنَ الْاَسَدِ، وَالذُّبَابَ مِنَ الذُّبَابِ"[1]

پھر آپ نے کیسے فرمایا کہ اونٹ شیاطین سے پیدا ہوتے ہیں؟

جواب: اسلام ایک سرمدی اور ابدی مذہب ہے، ایک دائمی اور عالمگیر نظریہ ہے، جو اپنے اندر ذرا سی بھی لچک کو برداشت نہیں کرتا، اسلام کے پیغامات اور احکامات کے اندر جو وسعت اور آفاقیت ہے وہ کسی بھی اہلِ علم سے مخفی نہیں، اور کیوں نہ ہو جبکہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دین حنیف کی اکملیت وجامعیت کو "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ"[2] کے ذریعہ واضح فرمایا، اور اس ملت بیضاء کی مقبولیت اور پسندیدیت کو "وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" کے ذریعہ آشکارا فرمایا، یہی وجہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک مجموعہ کمالات ودولت بے زوال بنا کر مبعوث کی گئی، کہ آپ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کو نہ آنا تھا، آپ کی تعلیمات کامل تھیں، جس کی تکمیل کے لئے کسی اور نبی کو آنا نہ تھا۔

آپ تعلیمات اسلام کے کسی بھی گوشہ کو اٹھائیں تو آپ کو اس میں تشنہ کامی کا احساس دامن گیر نہ ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ ہماری کوتاہ نظر تعلیمات اسلام کے حقیقی اسرار ورموز تک نہ پہنچ پائے، اور ہم تھوڑی دیر کے لئے الجھنوں کا شکار

---

(۱) تاویل مختلف الحدیث، ص:۲۰۴

(۲) سورۃ المائدۃ:۳

ہوجائیں، اوراس کے نتیجے میں ہم تعلیم اسلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردیں......
اسی پس منظر میں مذکورہ اعتراض اوراس جیسے اعتراض پیدا ہوتے ہیں۔

مذکورہ اعتراض کی متعدد توجیہات صاحب نیل الاوطار علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ، وصاحب بذل المجہود مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، اورعلامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہیں، ان توجیہات وتشریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔حضورصلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "لِاَنَّهَا خُلِقَتْ مِنَ الشَّيَاطِيْنِ" کا مطلب یہ ہے کہ اصل فطرت کے اعتبار سے اونٹ شیاطین سے پیدا ہوتے ہیں، نہ یہ کہ جنس جن وشیطان سے پیدا ہوتے ہیں کہ اعتراض پیدا ہو، اس بات کی تائید سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے، جس میں ہے کہ "اِنَّهَا خُلِقَتْ مِنْ اَعْنَانِ الشَّيَاطِيْنِ" اَىْ مِنْ جَوَانِبِهَا۔

عبارت ملاحظہ کیجئے:

> اِنَّهَا فِي اَصْلِ الْخِلْقَةِ خُلِقَتْ مِنْ جِنْسٍ خُلِقَتْ مِنْهُ الشَّيَاطِيْنُ، وَيَدُلُّكَ عَلٰى ذٰلِكَ قَوْلُهٗ فِيْ حَدِيْثٍ آخَرَ "اِنَّهَا خُلِقَتْ مِنْ اَعْنَانِ الشَّيَاطِيْنِ" يُرِيْدُ مِنْ جَوَانِبِهَا، وَنَوَاحِيْهَا، كَمَا يُقَالُ: بَلَغَ فُلَانٌ اَعْنَانَ السَّمَاءِ، اَىْ نَوَاحِيْهَا وَجَوَانِبِهَا۔
> وَلَوْ كَانَتْ مِنْ نَسْلِهَا، لَقَالَ: فَاِنَّهَا خُلِقَتْ مِنْ نَسْلِهَا، اَوْبُطُوْنِهَا، اَوْ اَصْلَابِهَا اَوْ مَايَشْبَهُ هٰذَا۔[1]

۲۔یاحضورصلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کا یہ مقصود ہوکہ جس طرح شیاطین سرکش، باغی اورشرارت پسند ہوتے ہیں، یہی حال اونٹ کی سرکشی اورشرارت کا ہے،

(۱) نیل الاوطار ۱/ ۱۵۲۔وتاویل مختلف الحدیث ص ۲۰۴

گویا شرارت وسرکشی میں اونٹ شیاطین کے مانند ہوتے ہیں، اسی بات کی طرف آپ نے "لِاَنَّهَا خُلِقَتْ مِنَ الشَّيَاطِيْنِ" کے ذریعہ اشارہ فرمایا، اس توجیہ وتشریح کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اہل عرب ابل کی ایک جنس کی سرکشی کی وجہ سے وحشی ہونے کی طرف نسبت کرتے تھے:

"وَلَمْ تَزَلِ الْعَرَبُ تَنْسَبُ جِنْسًا مِنَ الإِبِلِ اِلَى الْحُوْشِ فَتَقُوْلُ: نَاقَةٌ حُوْشِيَةٌ وَاِبِلٌ حُوْشِيَةٌ، وَهِيَ اَنفَرُ الإِبِلِ وَاَصْعَبِهَا"۔

۳۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما دیا کہ "اونٹ شیاطین سے پیدا کئے گئے ہیں" تو اس میں حیرت واستعجاب کی کیا بات ہے؟ اور یہ عقل کے بھی خلاف نہیں کہ انسان کے باپ آدم علیہ السلام کو اللہ پاک نے مٹی سے بنایا، پھر اسی آدم سے دوسرے انسان کو پیدا کیا، یعنی انسان کی حقیقت مٹی ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں انسان مٹی سے نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ ماں کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے، یہی حال اونٹ کی پیدائش کا ہے، کہ اصلاً تو اس کی خلقت جنس جن وشیاطین سے ہی ہے، جیسا کہ اصلاً انسان کی حقیقت مٹی ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسان رحم مادر سے دنیا میں آتا ہے۔ یہی حال اونٹ کی پیدائش کا ہے کہ وہ ثانیاً اونٹنی کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے ورنہ حقیقۃً اس کی اصل خلقت شیاطین وجن سے ہی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی توجیہات ہیں۔

جہاں تک بات رہی کہ آپ نے مرابض غنم میں نماز پڑھنے کی اجازت دی، بلکہ اسے باعثِ برکت قرار دیا، جبکہ مرابض ابل میں نماز پڑھنے سے منع کیا اس میں کیا حکمت ہے؟

ممانعت کی حکمت کو علامہ شوکانی نے اور صاحب بذل المجہود نے واضح فرمایا ہے، یہاں پر نیل الاوطار کی تحریر کا خلاصہ لکھا جا رہا ہے:

ا۔ ابل میں نفور و سرکشی کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے تو عین ممکن ہے کہ وہ دورانِ نماز راہ فرار اختیار کرلے، ایسی صورت میں اونٹ کا بھاگنا نماز کے توڑنے کا باعث ہوگا۔

۲۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی سرکشی کے باعث مصلّی کو اذیت و تکلیف پہنچا دے۔

۳۔ یا اس کی سرکشی کی وجہ سے مصلی کے قلب میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو، یہ خشوع و خضوع کے خلاف ہے۔ اور ظاہر ہے یہ کیفیت نماز میں اچھی چیز نہیں۔

علامہ شوکانی کی عبارت اس طرح ہے:

قَدْ قِيْلَ اِنَّ حِكْمَةَ النَّهْيِ مَا فِيْهَا مِنَ النُّفُوْرِ فَرُبَّمَا نَفَرَتْ وَهُوَ فِي الصَّلٰوةِ، فَتُؤَدِّيَ اِلٰى قَطْعِهَا اَوْ اَذىً يَحْصُلُ لَهُ مِنْهَا، اَوْ تُشَوِّشُ الْخَاطِرَ الْمُلْهِيْ عَنِ الْخُشُوْعِ فِي الصَّلٰوةِ۔[1]

☆نیل الاوطار ۱/۱۵۲۔

سورج اور چاند قیامت کے دن آگ میں جلیں گے

عَنْ عَبْدِ الْعَزِیْزِ بْنِ الْمُخْتَارِ الْاَنْصَارِی عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ الدَّانَاجِ[۱] قَالَ شَھِدْتُ اَبَا سَلَمَۃَ بْنَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ فِی مَسْجِدِ الْبَصَرَۃِ وَجَاءَ الْحَسَنُ فَجَلَسَ اِلَیْہِ فَحَدَّثَ عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ: اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ثَوْرَانِ مُکَوَّرَانِ فِی النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔[۲]

ترجمہ: عبداللہ داناج کہتے ہیں کہ میں بصرہ کی مسجد میں ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کے پاس تھا، کہ حسن آئے اور ان کے پاس بیٹھ گئے، پھر انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ایک حدیث بیان کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سورج اور چاند قیامت کے دن لپٹے ہوئے آگ میں جل رہے ہوں گے۔

اعتراض: مذکورہ روایات پر اعتراض یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن سورج اور چاند آگ میں جل رہے ہوں گے، گویا ان کو بھی

---

(۱) کلمة فارسية معربة "دانا عرب" بزيادة الجيم كنظائرہ من صغار التابعين، واسم ابيه فيروز الديلمی، من هامش الدمشقية۔

(۲) رواہ البخاری، باب بدء الخلق، رقم الحديث ۳۲۰۰ واحمد: ۲۰/۲۰۷۔

عذاب دیا جائے گا، اس پر شبہ یہ ہے کہ جزاء وسزا کا دارو مدار اعمال صالحہ واعمال سیئہ پر ہے اور مکلّف چونکہ جن وانس ہیں اس لئے انہی پر جزاء وسزا مرتب ہوگی، چاند سورج چونکہ مکلّف نہیں ہیں، اس لئے ان کو عذاب کیسے دیا جائے گا؟

جواب: اس شبہ کا جواب متعدد محققین نے دیا ہے، جن میں علامہ خطابی، علامہ ابن قتیبہؒ اور علامہ ابو العلاء محمد بن عبد الرحمٰن مبارکپوریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، علامہ ابن حجر نے اپنی معرکۃ الاراء تصنیف فتح الباری میں امام خطابی کا قول نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ واقعۃً چاند وسورج مکلّف نہیں ہیں کہ ان کو جہنم میں ڈال کر عذاب دیا جائے، بلکہ ان دونوں کو جہنم میں ڈالنے کا مقصد یہ ہوگا کہ جو کافر ان دونوں کی پرستش کیا کرتے تھے، وہ ان کی لاچاری اور مجبوری کو دیکھیں، اور خود کو اس پر کوسیں کہ ایسی مجبور محض ذات کی عبادت ہم نے کیوں کی، جو اپنے آپ کو بھی جہنم کی آگ سے نہ بچا سکی۔

قَالَ الْخَطَّابِی: "لَیْسَ الْمُرَادُ بِکَوْنِهِمَا فِی النَّارِ تَعْذِیبُهُمَا بِذٰلِكَ، وَلٰکِنَّه تَبْکِیْتٌ لِمَنْ کَانَ یَعْبُدُهُمَا فِی الدُّنْیَا لِیَعْلَمُوْا اِنَّ عِبَادَتَهُمْ لَهُمَا کَانَتْ بَاطِلًا"۔ (۱)

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کو جہنم میں اس لیے داخل کیا جائے گا کہ قاعدہ "کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِه" یعنی ہر شی اپنی اصل کی طرف لوٹ جایا کرتی ہے، چونکہ دونوں کی اصل جہنمی ہے، اس لیے وہاں دونوں کو واپس کر دیا جائے گا، اس کا مقصد انہیں عذاب دینا ہے ہی نہیں کہ ان کے مکلّف ہونے اور منشاء عذاب وجزاء کے خلاف ہونا لازم آئے گا۔ علامہ ابن قتیبہ نے یہی جواب دیا ہے:

"اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَمْ یُعَذَّبَا بِالنَّارِ حِیْنَ اُدْخِلَاهُمَا فَیُقَالُ:

---

(۱) فتح الباری شرح البخاری (للحافظ ابن حجر شافعی مکی عسقلانی)(۳۶۹/۶)

مَا ذَنبُهُمَا؟ وَلٰكِنَّهُمَا خُلِقَا مِنهَا ثُمَّ رُدَّا اِلَيهَا"۔[1]

اس جواب کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جس کی تخریج امام احمد بن حنبل نے کی ہے:

روایت کا حاصل یہ ہے کہ سورج دہکتی ہوئی آگ (فِيْ نَارِ اللّٰهِ الْحَامِيَةِ) کی صورت میں غروب ہوتا ہے، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم اس کو جلانے سے نہ روکتا تو یہ سورج روئے زمین کی ہر چیز کو خاکستر کر دیتا۔ (مسند احمد بن حنبل ۲ / ۲۰۷)

اس حدیث میں آپ نے سورج کی تمازت اور اس کی تپش کو بیان کیا ہے، جس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ سورج اور چاند دونوں کی تخلیق آگ سے نہیں ہوئی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: نماز ظہر کو ٹھنڈی کر کے پڑھو، اس لئے کہ گرمی کی شدت جہنم کی حرارت سے ہوا کرتی ہے:

اَبْرِدُوْا بِالصَّلٰوةِ فَاِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ"۔[2]

دوسری توجیہ اور حدیث بالا سے یہ بات بالکل بے غبار ہو جاتی ہے کہ سورج اور چاند کی تخلیق آگ سے ہوئی اس لئے ان دونوں کو اپنی اصل کی طرف لوٹا دیا جائے۔

۳۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حاکم مقتدر اعلیٰ اور مختار کل ہیں اس نے ہر شئی کو الگ الگ کام پر لگا دیا ہے، مثلاً آگ کو جلانے پر اور کشتی کو چلنے پر، اور سمندر کو بہنے پر مامور کر دیا ہے۔ ان سب کا اب کام ہی یہ ہے کہ انہیں انجام دیتے رہیں، ان کا ان کاموں کو انجام دینا تعذیب نہیں ہے، اور نہ کوئی اس کو تعذیب کہتا ہے اور مکلّف نہ ہونے کی وجہ سے قیامت کے دن اس کو ثواب بھی نہیں ملے گا۔ اسی طرح اللہ نے سورج اور چاند کا کام اپنی دنیا تک روشنی اور گرمی پہنچانا متعین کیا ہے، اور دنیا

---

(۱) تاویل مختلف الحدیث لعلامة ابن قتیبةؒ ص ۱۶۵ فتح الباری ۶/ ۳۶۹ بلفظ وقیل: انهما خلقا من النار فاعیدا فیها۔ (۲) رواہ البخاری

کے ختم ہونے کے بعد ان کا جہنم میں رہنا مقرر کر دیا تو اس پر کسی کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ ارشاد باری "اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا کہ پتھر کو عذاب کیوں ہوگا۔ کیونکہ یہ تعذیب نہیں بلکہ ان کے کام کی تعیین ہے، لہٰذا شبہ بے محل ہے:

"وَمَا كَانَ مِنَ الْمُسَخَّرِ الْمَقْصُوْرِ عَلٰى فِعْلٍ وَاحِدٍ كَالنَّارِ وَالْفَلَكِ، الْمُسَخَّرِ الدَّوَّارِ، وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ وَأَشْبَاهُ ذٰلِكَ لَا يَقَعُ بِهِ تَعْذِيْبٌ وَلَا يَكُوْنُ لَهُ ثَوَابٌ، وَمَا مِثْلُ هٰذَا، إِلَّا مِثْلَ رَجُلٍ سَمِعَ بِقَوْلِ اللّٰهِ، "فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" فَقَالَ: مَاذَنْبُ الْحِجَارَةِ؟"۔[1]

۴۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کے جہنم میں ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ان دونوں کو عذاب ہی دیا جائے گا، جہنم میں اللہ پاک کی اور مخلوقات بھی ہوں گی مثلاً فرشتے، سانپ، بچھو، پتھر، پیپ وغیرہ اور یہ سب جہنم والوں کو عذاب دینے کے لئے مامور ہوں گے، اس کی رو سے ان چیزوں کا جہنم میں ہونا لازمی اور ضروری ہے، اور ان کے جہنم میں ہونے سے ان کو عذاب دیا جانا لازم نہیں آتا، اسی طرح جہنم میں اگر چاند سورج بھی ہوں تو ان کو بھی عذاب دیئے جانے کا شبہ کرنا درست نہ ہوگا۔

ابن حجر نے امام اسماعیل کا یہ جواب ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے:

وَقَالَ الْإِسْمَاعِيْلِيُّ: لَا يَلْزَمُ مِنْ جَعْلِهِمَا فِي النَّارِ تَعْذِيْبُهُمَا فَإِنَّ لِلّٰهِ فِي النَّارِ مَلَائِكَةً، وَحِجَارَةً وَغَيْرَهَا لِتَكُوْنَ لِأَهْلِ النَّارِ عَذَابًا وَآلَةً مِنْ آلَاتِ الْعَذَابِ وَمَا شَاءَ اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ فَلَا تَكُوْنُ هِيَ مُعَذَّبَةً۔[2]

---

(۱) تاويل مختلف الحديث لابن قتيبة" ص ۱۶۵

(۲) فتح الباری ۶/۳۶۹۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو طمانچہ لگا دیا

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ: اُرسِلَ مَلَكُ الْمَوْتِ اِلٰی مُوسٰی فَلَمَّا جَاءَهُ لَطَمَهُ فَرَجَعَ اِلٰی رَبِّهٖ فَقَالَ: اَرْسَلْتَنِی اِلٰی عَبْدٍ لَا یُرِیْدُ الْمَوْتَ قَالَ: اِرْجِعْ اِلَیْهِ فَقُلْ لَهٗ: یَضَعُ یَدَهٗ عَلٰی مَتْنِ ثَوْرٍ فَلَهٗ بِمَا غَطَّتْ یَدُهٗ بِکُلِّ شَعْرَةٍ سَنَةً قَالَ: اَیْ رَبِّ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: ثُمَّ الْمَوْتُ قَالَ: فَالْاٰنَ قَالَ: فَسَاَلَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَنْ یُدْنِیَهٗ مِنَ الْاَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ رَمْیَةً بِحَجَرٍ"۔ [۱]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ملک الموت کو حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے پاس بھیجا گیا، جب وہ وہاں پہنچے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ ان کی ایک آنکھ متاثر ہوگئی، وہ واپس اپنے رب کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ آپ نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا ہے جو مرنا نہیں چاہتا (اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتہ کی آنکھ درست کردی) اور فرمایا: پھر ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ وہ کسی بیل کی پشت (پیٹھ) پر ہاتھ رکھے، ان کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے، ہر ایک کے بدلے ایک سال کی مہلت ملے گی، یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام نے پوچھا، پھر

(۱) صحیح البخاری ۱/۴۸۳۔ باب وفاۃ مریم

مسلم بلفظ "ان موسی لطم عین الملك الموت فاعورہ" کتاب الفضائل رقم الحدیث ۱۵۷

نسائی، کتاب الجنائز، رقم الحدیث ص ۱۲۱، مسند احمد: ۲/۲۶۹۔۳۱۵۔

کیا ہوگا؟ تو ملک الموت نے جواب دیا پھر موت ہے۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ پھر تو ابھی ہی بہتر ہے، چنانچہ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ انہیں ارض مقدس میں جگہ دے جو ایک فرلانگ پر تھا۔

اعتراض: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ان روایات میں سے ہے جس پر مستشرقین نے اعتراض کیا کہ کسی نبی کی شان سے یہ بات بعید تر معلوم ہوتی ہے کہ وہ موت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے، نیز یہ بھی کسی نبی کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی فرشتہ پر ہاتھ اٹھائے، وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ وہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں آیا ہو، اور اگر موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کیا تھا تو ان سے قصاص لینا چاہئے تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا، ان وجوہات سے یہ روایت فرمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے اسرائیلی روایت معلوم ہوتی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے امام ابوبکر ابن خزیمہ کے حوالہ سے یہ اعتراض ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

قَالَ ابْنُ خُزَيْمَةَ: "أَنْكَرَ بَعْضُ الْمُبْتَدِعَةِ هٰذَا الْحَدِيْثَ وَقَالُوْا: إِنْ كَانَ مُوْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَرَفَهٗ فَقَدْ إِسْتَخَفَّ بِهٖ وَإِنْ كَانَ لَمْ يَعْرِفْهُ فَكَيْفَ لَمْ يُقْتَصَّ لَهٗ مِنْ فَقْءِ عَيْنِهٖ"؟[1]

جواب: اس روایت کو امام بخاریؒ کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی بیان کیا ہے، مثلاً امام مسلمؒ نے" نیز یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے اور صحیح الاسناد بھی ہے۔ اس حدیث پر کئے گئے اعتراض کا جواب کئی حضرات نے دیا ہے، بعض حضرات نے تو اس کا جواب یہ دیا ہے کہ واقعہ حقیقی نہیں، بلکہ محض تمثیلی ہے، علامہ ابن قتیبہؒ نے

☆ فتح الباری ۵۴۶/۶۔

بھی فرشتہ کی آنکھ کو تمثیلی مانا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ان کی آنکھ لوٹا دینے کی یہ توجیہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کو اصل تخلیق پر لوٹا دیا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”وَلَمَّا تَمَثَّلَ مَلَكُ الْمَوْتِ لِمُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَهٰذَا مَلَكُ اللّٰهِ، وَهٰذَا نَبِيُّ اللّٰهِ، وَجَاذِبُهُ لَطَمَهُ مُوْسٰى لَطْمَةً أَذْهَبَتِ الْعَيْنَ الَّتِيْ هِيَ تَخْيِيْلٌ وَتَمْثِيْلٌ، وَلَيْسَتْ حَقِيْقَةً، وَعَادَ مَلَكُ الْمَوْتِ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِلٰى حَقِيْقَةِ خِلْقَتِهِ الرُّوْحَانِيَّةِ كَمَا كَانَ، لَمْ يَنْتَقِصْ مِنْهُ شَيْءٌ“۔ (۱)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کو فرشتہ کی آزمائش کے لئے تھپڑ مارنے کی اجازت دی ہو۔

وَقَالَ النَّوَوِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ: ”لَا يَمْتَنِعُ أَنْ يَأْذَنَ اللّٰهُ لِمُوْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ فِيْ هٰذِهِ اللَّطْمَةِ اِمْتِحَانًا لِلْمَلْطُوْمِ“۔ (۲)

امام ابوبکر ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مذکورہ شبہ کی گنجائش اس وقت ہوسکتی تھی جب کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کو یہ بات معلوم ہوتی کہ آنے والا فرشتہ ہے، اور وہ اللہ کے حکم سے ان کی روح قبض کرنے آیا ہے، لیکن حدیث میں ایسی کوئی صراحت نہیں ہے، اس لئے اس بات کا امکان موجود ہے کہ مذکورہ فرشتہ انسانی شکل میں آیا ہو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ شبہ ہوا ہو کہ اس کا ارادہ انہیں نقصان پہنچانے کا ہے، چنانچہ اپنے دفاع میں انہوں نے ہاتھ اٹھایا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھپڑ مارنے کی توجیہ اس طرح بھی کی جاسکتی ہے

---

(۱) تاویل مختلف الحدیث للعلامۃ ابن قتیبۃ ص۳۳۵

(۲) فتح الباری ۶/۵۴۶

کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرشتہ کو تھپڑ اس لئے رسید کیا کہ انہوں نے فرشتہ کو انسان تصور کیا، اور دیکھا کہ وہ بغیر اجازت گھر میں داخل ہو رہا ہے، اور کوئی آدمی بغیر اجازت کے چھپ کر کسی گھر میں جھانکے اور دیکھے تو اس کی آنکھ کو ضائع کر دینا درست ہے۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تھپڑ رسید کیا جس سے فرشتہ کی آنکھ متأثر ہوگئی۔

فرشتوں کا انسانی شکل میں متشکل ہونا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ یہ واقعہ پیش آچکا ہے مثلاً فرشتوں کی ایک جماعت حضرت ابراہیم علیہ السلام ولوط علیہ السلام کے پاس آئی۔ ابتداءً انہوں نے نہیں پہچانا کہ یہ فرشتے ہیں، اس وجہ سے انہوں نے ان کی ضیافت کا سامان کیا اور مینڈھا ذبح کیا جیسا کہ قرآن کریم میں سورہ ذاریات میں مفصل موجود ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتے کبھی دحیہ کلبی کی شکل میں کبھی اپنی صورت میں، کبھی اور دیگر شکل میں آتے تھے۔

غرضیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس فرشتہ انسانی شکل میں آیا تھا، جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہچانا نہیں، اس لئے تھپڑ رسید کیا کہ انہوں نے اجازت نہیں لی تھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوبکر بن خزیمہ کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے:

”وَالْجَوَابُ اَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَبْعَثْ مَلَكَ الْمَوْتِ لِمُوْسٰى وَهُوَ يُرِيْدُ قَبْضَ رُوْحِهٖ حِيْنَئِذٍ، وَاِنَّمَا بَعَثَهٗ اِلَيْهِ اِخْتِبَارًا وَاِنَّمَا لَطَمَ مُوْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ مَلَكَ الْمَوْتِ لِاَنَّهٗ رَاٰى آدَمِيًّا دَخَلَ دَارَهٗ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ وَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّهٗ مَلَكُ الْمَوْتِ، وَقَدْ اَبَاحَ الشَّارِعُ فَقْءَ عَيْنِ النَّاظِرِ فِيْ دَارِ الْمُسْلِمِ بِغَيْرِ اِذْنٍ، وَقَدْ جَاءَتِ

الْمَلَائِكَةُ اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ فَلَمْ يَعْرِفْهُمْ لَمَّا قَدَّمَ لَهُمُ الْمَأْكُوْلَ، وَلَوْعَرَفَهُمْ لُوْطًا لَمَا خَافَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَوْمِه"[1]

اس رائے کو حدیث کے اس حصے سے بھی مزید تقویت ملتی ہے کہ جس میں ہے کہ مذکورہ فرشتہ جب دوبارہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے پاس آیا اور اس نے باضابطہ اللہ کا فرمان آپ تک پہنچایا تو آپ نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور عارضی زندگی کے بجائے اپنے لیے موت کو پسند کیا، لیکن اس میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے پہچانا نہیں، تو پھر فرشتہ کا اللہ تعالیٰ سے جا کر یہ کہنا کہ آپ نے ایسے بندہ کے پاس بھیج دیا جو مرنے کے لئے تیار نہیں ہے صحیح نہیں ہوگا۔

اس لئے اس کی سب سے بہترین توجیہ وہ ہے جو حافظ بن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن خزیمہ کے حوالے سے نقل کی ہے، نیز علامہ قرطبی نے بھی وہ توجیہ بیان کی ہے۔[2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بات سے واقف تھے کہ یہ ملک الموت ہے، اور روح قبض کرنے کے لئے آیا ہے، لیکن اس نے اختیار کی وضاحت کئے بغیر روح قبض کرنا چاہی، جبکہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں اختیار دیا ہے جیسا کہ اس حدیث سے ثابت ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ رُوْحَ نَبِيٍّ حَتّٰى يُخَيِّرَهُ"[3]

---

(۱) فتح الباری شرح البخاری ۵۴۶/۶

(۲) المفهم للعلامة القرطبی ۲۶۱/۶

(۳) بخاری شریف، رقم الحدیث: ۲۵۰۹، مسلم رقم الحدیث: ۲۴۴۴

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کسی نبی کی روح کو قبض نہیں کرتا مگر یہ کہ ان کو پہلے اختیار دیا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پہلے ہر نبی کو موت وزیست کے مابین اختیار دیا جاتا ہے، اگر نبی موت کو پسند کرے تو موت واقع ہوجاتی ہے ورنہ نہیں، چنانچہ غیر معروف طریقہ پر آنے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرشتے کو بطورتا دیب مارا۔

اس توجیہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب فرشتہ دوبارہ آیا اور اس نے فرمان الٰہی کے مطابق زندگی اور موت کے درمیان انتخاب کا اختیار دیا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے موت کو پسند فرمایا۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ابن خزیمہ کے اس جواب کو جس کی تلخیص امام خطابی نے کی ہے ان الفاظ کے ذریعہ واضح کیا ہے:

وَلَخَّصَ الْخَطَابِیُّ کَلَامَ ابْنَ خُزَیْمَةَ وَزَادَ فِیْهِ اَنَّ مُوْسٰی دَفَعَهُ عَنْ نَفْسِهٖ لَمَّا رَاٰی فِیْهِ مِنَ الْحِدَّةِ وَاَنَّ اللّٰهَ عَیَّنَ مَلَكَ الْمَوْتِ لِیَعْلَمَ مُوْسٰی اَنَّه جَاءَهُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَلِهٰذَا اِسْتَسْلَمَ حِیْنَئِذٍ۔ وَقَالَ الْبَعْضُ۔۔۔اِنَّمَا لَطَمَهُ لِاَنَّه جَاءَهُ لِقَبْضِ رُوْحِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّخَیِّرَهُ، لِمَا ثَبَتَ اَنَّهٗ لَمْ یُقْبَضْ نَبِیٌّ حَتّٰی یُخَیَّرَ، فَلِهٰذَا لَمَّا خَیَّرَهُ فِی الْمَرَّةِ الثَّانِیَةِ اَذْعَنَ۔(۱)

(۲) فتح الباری ۶/۵۴۶۔

جنت وجہنّم کے درمیان مباحثہ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهُ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ :تَحَاجَّتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ، فَقَالَتِ النَّارُ، اُوْثِرْتُ بِالْمُتَكَبِّرِیْنَ وَالْمُتَجَبِّرِیْنَ، وَقَالَتِ الْجَنَّةُ: مَالِی لَا یَدْخُلُنِی اِلَّا ضُعَفَاءُ النَّاسِ وَسَقَطِهِمْ، وَقَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی لِلْجَنَّةِ: اَنْتِ رَحْمَتِی اَرْحَمُ بِكَ مَنْ اَشَاءُ مِنْ عِبَادِیْ، وَقَالَ لِلنَّارِ: اِنَّمَا اَنْتِ عَذَابِی اُعَذِّبُ بِكَ مَنْ اَشَاءُ مِنْ عِبَادِیْ، وَلِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا مَالِئُوْهَا فَاَمَّا النَّارُ فَلَا تَمْتَلِی، حَتّٰی یَضَعَ رِجْلَهٗ فَتَقُوْلُ: قَطْ قَطْ قَطْ، فَهُنَالِكَ تَمْتَلِیْ وَیزْوِیْ بَعْضُهَا اِلٰی بَعْضٍ، وَلَا یَظْلِمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مِنْ خَلْقِهٖ اَحَدًا۔ وَاَمَّا الْجَنَّةُ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یُنْشِئُ لَهَا خَلْقًا"۔[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جنت اور جہنم میں مباحثہ ہوا، جہنم نے کہا: میرے پاس جبار اور متکبر لوگ ہیں، جنت نے کہا: پتہ نہیں کیا بات ہے، میرے پاس کمزور اور گرے پڑے لوگ ہی آتے ہیں، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت سے کہا: تو میری رحمت ہے، میں اپنے بندوں میں سے جسے چاہوں گا نواز دوں گا اور جہنم سے کہا: تو میرا عذاب

(۱) بخاری، کتاب تفسیر القرآن۔ باب وتقول هل من مزید، رقم ۴۸۵۰

مسلم کتاب الجنة و وصف نعیمها، باب النار یدخلها الجبارون، رقم الحدیث، ۲۸۴۸۔

ترمذی: کتاب صفة الجنة، باب ماجاء فی احتجاج الجنة والنار، ۲۵۶۱

ہے اور تم دونوں کو بھرنا میری ذمہ داری ہے، اور جہاں تک بات ہے جہنم کے بھرنے کی تو وہ اس وقت تک نہیں بھرے گی جب تک کہ اللہ پاک اپنے قدم کو اس میں نہ رکھدیں، اس کے بعد جہنم کہے گی بس۔بس۔بس پھر وہ بھر جائے گی۔

اعتراض: مذکورہ روایت کو دو اعتبار سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، اعتراض کا پہلا پہلو یہ ہے کہ اس حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت وجہنم میں مباحثہ ہوا، اس قول پر شبہ یہ ہے کہ جنت اور جہنم دونوں بے جان چیزیں ہیں، پھر ان دونوں کے مابین مباحثہ اور گفتگو کیا معنی رکھتا ہے؟

اعتراض کا دوسرا رخ یہ ہے کہ حدیث مذکور میں جہنم کے بھرنے کے سلسلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا پاؤں رکھنا ثابت کیا گیا ہے، جو خدائے پاک کے حق میں بالکل غیر مناسب ہے، کیونکہ اس سے اللہ پاک کا حادث ہونا لازم آئے گا، جو محال ہے۔

جواب: یہ روایت قدیم زمانہ ہی سے منکرین حدیث اور مستشرقین کی تنقید کا نشانہ بنی رہی ہے، علماء ومحدثین کی جانب سے ہر دور میں اس طرح کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا رہا ہے، علامہ ابن قتیبہ رحمہ اللہ (م ۲۷۶ھ) حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ، مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم وغیرہ اس باب میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات محدثین نے حدیث کی صحت سے متعلق پھلائے جانے والے اعتراض اور شکوک وشبہات کے ازالہ کی کامیاب کوشش کی ہے، نیز ان کے سوالات کے مدلل اور تشفی بخش جوابات بھی دیے ہیں۔

بہر حال مذکورہ روایت دو وجہ سے تنقید کا نشانہ بنی، جنت اور جہنم جو ایک غیر ذی روح اور بے جان چیز ہے، کے درمیان گفتگو کیسے ہوئی، نیز اللہ عز وجل کے لئے جہنم

میں پیر رکھنا ثابت کیا گیا، جو ذات باری تعالیٰ کے شایان شان نہیں ......لیکن حقیقت میں یہ دونوں شبہات بے معنیٰ ہیں، کیونکہ جہاں تک بات ہے جنت اور جہنم میں مباحثہ کی، تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ جنت اور جہنم میں گفتگو بطور تمثیل کے بیان کی گئی ہے، اور یہ عربی زبان وادب میں بہت ہی عام ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جنت اور جہنم کے درمیان یہ مباحثہ دراصل جنت اور جہنم کے فرشتوں کے مابین ہوا ہو۔ اور اسے مجازاً حذف کردیا گیا ہو، ”ای تَحَاجَتِ(تَخَاصَمَتْ)مَلَائِكَةُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ“ اور اس طرح کے استعمالات عربی زبان میں کثرت سے ہوتے ہیں، خود قرآن وحدیث میں اس قسم کی بہت سی تعبیریں ملتی ہیں، مثلاً قرآن کریم میں ہے:

فَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ أَيْ اَهْلَ الْقَرْيَةِ۔

یہ جواب بھی ہوسکتا ہے کہ جنت اور جہنم کے درمیان یہ مباحثہ حقیقت میں ہوا ہو جیسا کہ بعض علماء کا یہی خیال ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو ہر چیز پر قادر ہے وہ اس بات کی قدرت اور طاقت بھی رکھتا ہے کہ بے زبان چیز کو زبان عنایت کردے۔ جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم رقمطراز ہیں:

قَالَ النَّوَوِيُّ: "هٰذَا الْحَدِيْثُ عَلٰى ظَاهِرِهٖ، وَاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَعَلَ فِي النَّارِ وَالْجَنَّةِ تَمْيِيْزًا تُدْرِكَانِ بِهٖ، فَحَاجَّتَا وَلَا يَلْزَمُ مِنْ هٰذَا اَنْ يَكُوْنَ ذٰلِكَ التَّمِيْزُ فِيْهِمَا دَائِمًا۔

وَقَالَ الْقُرْطُبِيُّ: وَقِيْلَ: اِنَّ تَحَاجّهُمَا بِلِسَانِ الْحَالِ، وَالْحَاصِلُ، اَنَّ مُحَاجَّةَ النَّارِ وَالْجَنَّةِ تَحْتَمِلُ اَنْ تُحْمَلَ عَلَى الْحَقِيْقَةِ وَاَنْ تُحْمَلَ عَلَى الْمَجَازِ"۔[1]

(۱) تکملہ فتح الملہم ۲/ ۲۰۳، فتح الباری ۸/ ۷۶۸

اعتراض کا دوسرا رخ یہ تھا کہ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ عزوجل کے جہنم میں پاؤں رکھنے کا ذکر ہے جو خدا کے شایانِ شان نہیں، اس شبہ کے بھی کئی جوابات دیئے گئے ہیں:

بنیادی طور پر یہ بات ذہن نشیں کر لینی چاہئے کہ اللہ پاک کا جہنم میں قدم رکھنا متشابہات میں سے ہے، اور متشابہات کے باب میں علماء سلف کا مسلک یہی رہا ہے کہ ان جیسی آیت واحادیث پر ایمان رکھا جائے اور اس کی تفصیل اور کیفیت کے بارے میں خاموشی اختیار کی جائے۔

صاحب تکملہ فتح الملہم نے اسی جواب کو اولیٰ اور راجح قرار دیا:

"فَیَضَعُ قَدَمَہُ عَلَیْھَا، ھٰذَا مِنْ اَحَادِیْثِ الصِّفَاتِ،وَاَنَّ الْمَذْھَبَ الرَّاجِحَ فِیْھَا اَنْ نُؤْمِنَ بِھَا کَمَا جَاءَ تْ،وَلَا نَخُوْضُ فِیْ بَیَانِ کَیْفِیَتِھِمَا، مَعَ الْاِیْمَانِ بِاللّٰہِ نُزِّہَ عَنِ الْجَوَارِحِ الْمَعْرُوْفَۃِ وَلَا یُشْبِھُھُمَا"

علماء خلف کے مسلکِ تاویل کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وَلَا شَکَّ اَنَّ الْمَذْھَبَ الْاَوَّلَ وَھُوَ السُّکُوْتُ عَنْ بَیَانِ الْمُرَادِ، اَوْلٰی وَاَرْجَحُ، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔

لیکن بعض حضرات نے اس کی تاویل کی ہے، مثلاً قدم سے مراد حقیقت میں وہ گروہ اور جماعت ہے جو بعد میں جہنم میں ڈالی جائے گی اس لئے کہ جہنم میں لوگوں کو سلسلہ وار ڈالا جائے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قدم رکھنے سے مراد جہنم کی تذلیل اور اسے خاموش کرنے سے کنایہ ہے، اس لئے کہ جہنم کی آگ قیامت کے دن انتہائی خوفناک انداز میں بھڑک اٹھے گی، لیکن جب وہ حد سے آگے بڑھنے لگے گی اور اس

سے اہل محشر کو خطرہ پیدا ہو جائے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اسے خاموش رہنے کا حکم دیں گے۔ جس کی وجہ سے اس کے مزید مطالبات ختم ہو جائیں گے۔ اور جہنم کہنے لگے گی قط قط، یعنی بس بس کافی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ قدم سے مراد بعض مخلوق کے ہی پیر ہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:

وَاخْتُلِفَ فِي الْمُرَادِ بِالْقَدَمِ: فَقَالَ الْمُرَادُ إِذْلَالُ جَهَنَّمَ فَإِنَّهَا إِذَا بَالَغَتْ فِي الطُّغْيَانِ وَطَلَبَتِ الْمَزِيْدَ أَذَلَّهَا اللّٰهُ فَوَضَعَهَا تَحْتَ الْقَدَمِ وَلَيْسَ الْمُرَادُ حَقِيْقَةَ الْقَدَمِ وَالْعَرَبُ تَسْتَعْمِلُ أَلْفَاظَ الْأَعْضَاءِ فِيْ ضَرْبِ الْأَمْثَالِ وَلَا تُرَادُ يَدُ أَعْيَانِهَا كَقَوْلِهِمْ رَغِمَ أَنْفُهُمْ وَقِيْلَ الْمُرَادُ بِالْقَدَمِ اَلْفَرَطُ السَّابِقُ أَيْ يَضَعُ اللّٰهُ فِيْهَا بِأَقْدَامِهِ لَهَا مِنْ أَهْلِ الْعَذَابِ وَقِيْلَ: الْمُرَادُ بِالْقَدَمِ قَدَمُ بَعْضِ الْمَخْلُوْقِيْنَ۔ (فتح الباری ج۸، ص: ۲۲ے)

بندر نے بندرنی کو رجم کیا

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ: "اِنَّ قِرَدًا رَجَمَتْ قِرَدَةً فِیْ زِنًی"۔

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''بندروں نے بندرنی کو سنگسار کیا زنا کے جرم میں''۔

شادی بیاہ (جس کی اہمیت وافادیت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے) اس کا تعلق اشرف المخلوقات یعنی اولادِ آدم سے ہے، حیوانات جو غیر مکلّف اور غیر ذوی العقول ہیں ان میں شادی بیاہ نہیں ہوا کرتا اور نہ ان میں نکاح کا کوئی تصور پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ بات بہت ہی مستبعد ہے کہ بندروں نے بندرنی کو زنا کرنے کی پاداش میں سنگسار کیا ہو، کیونکہ رجم تو مُحصن (شادی شدہ) مردوں اور عورتوں کا زنا کے جرم میں کیا جاتا ہے، حیوانات میں جب شادی بیاہ کا تصور ہی نہیں تو پھر ان میں زنا کا تصور ہی نہیں ہوسکتا، اور مکلّف بھی تو نہیں ہیں کہ ان کو رجم کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں آزاد ہوتے ہیں۔ طبیعت جس کی طرف مائل ہوجائے اس سے وہ اپنی شہوت پوری کرلیتے ہیں۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ''بندروں نے بندرنی کو سنگسار کیا'' بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، اور اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ بگڑتی ہے، جو اہلِ علم سے مخفی نہیں؟

اس اعتراض کا جواب بالحشینِ حدیث، وعلماء محدّثین نے دیا ہے، جن میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ

سرفہرست ہیں۔

علامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس حدیث کا سرے سے انکار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں، یہ روایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے نہ کسی صحابی سے، لہٰذا اسے حدیثِ رسول کہہ کر پیش کرنا اور پھر اس پر اعتراض کرنا درست ہی نہیں ہے۔

علامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

قَالَ اَبُوْ مُحَمَّدٍ: "وَنَحْنُ نَقُوْلُ فِيْ جَوَابِ هٰذَا الْاِسْتِهْزَاءِ اِنَّ حَدِيْثَ الْقُرُوْدِ لَيْسَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَا عَنْ اَصْحَابِهٖ"۔[1]

غرضیکہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے "اِنَّ قُرُوْدًا رَجَمَتْ قِرَدَةً فِيْ زِنٰى" والی روایت کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔

ابن قتیبہ سے اس مقام پر دو تسامح ہوئے ہیں:

۱۔ ایک تو ان کا حدیث ہی کا انکار کر دینا کہ یہ نہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ ہی کسی صحابیٔ رسول سے، حالانکہ اس روایت کی اصل موجود ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اس روایت کو نقل کیا ہے، اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی صحیح میں اس روایت کو درج فرمایا ہے۔ روایت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

حَدَّثَنَا نُعَيْمُ بْنُ حَمَّادٍ، حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ عَنْ حُصَيْنٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُوْنٍ قَالَ: "رَاَيْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ قِرَدَةً اِجْتَمَعَ عَلَيْهَا قِرَدَةٌ

---

(۱) تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبه ص ۳۰۷

قَدْ زَنَتْ فَرَجَمُوْهَا فَرَجَمْتُهَا مَعَهُمْ"۔(۱)

۲۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے عمرو بن میمون کو صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم شمار نہیں کیا، حالانکہ عمرو بن میمون صحابی رسول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات ثابت ہے، عمرو بن میمونؓ جن کی کنیت ابوعبداللہ اور نسب "الاودی" ہے، انہوں نے زمانۂ جاہلیت کو بھی پایا ہے، اور اسلام کو بھی، آپ کے دستِ مبارک پر ہی انہوں نے اسلام قبول کیا، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ستر یا سوحج کئے، علامہ ابن مدرہ، ابونعیم اور ابن عبدالبر نے ان کے حالات اپنی اپنی کتابوں میں لکھے ہیں، ان کی وفات ۷۵ھ میں ہوئی۔

اسد الغابہ کی عبارت ملاحظہ کیجئے:

"عَمْرُو بْنُ مَيْمُوْنٍ الاَوْدِيُّ، اَبُوْ عَبْدِاللّٰهِ، اَدْرَكَ الْجَاهِلِيَّةَ وَكَانَ قَدْ اَسْلَمَ فِي زَمَانِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَحَجَّ مِأَةَ حَجَّةٍ، وَقِيْلَ سَبْعُوْنَ حَجَّةً، وَاَدّٰى صَدَقَتَهُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ......"(۲)

غرض یہ کہ عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ صحابی رسول ہیں، جیسا کہ اسد الغابہ اور دوسری کتب میں ان کے صحابی ہونے کی صراحت ہے، ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے ان کو صحابی نہیں مانا، باوجودیکہ انہوں نے عمرو بن میمون کے حوالے سے مذکورہ روایت کو نقل کیا ہے، لیکن اس خیال کے ساتھ کہ عمرو بن میمون شاید کوئی تابعی ہیں جنہوں نے زمانۂ جاہلیت کو پایا ہے۔

---

(۱) رواه البخاري، باب القسامة في الجاهلية، رقم الحديث: ۳۸۴۹

(۲) اسد الغابة في معرفة الصحابة لعز الدين ابن الاثير ۲۹۲/۴

بہرحال جب یہ بات محقَّق ہوگئی کہ یہ روایت بخاری میں موجود ہے، تو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مذکورہ سوال کا جواب دیا جائے، لیکن جواب سے پہلے روایت کا پس منظر بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:

عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں یمن میں اپنی پالتو بکری کی نگہبانی کر رہا تھا، اسی اثنا میں میں نے دیکھا کہ ایک بندر بندرنی کے ساتھ آیا اور بندرنی کے ہاتھ کو تکیہ بنا کر سو گیا، پھر اس کے بعد ایک اور بندر آیا، اور اس نے بندرنی کو ٹٹولا، بندرنی نے آہستہ سے اپنے ہاتھ کو پہلے بندر کے سر کے نیچے سے کھینچ لیا، اس کے بعد بندرنی نے اس نو وارد بندر کے ساتھ جماع کر لیا، راوی کہتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، پھر جب یہ دونوں اپنی شہوت پوری کر چکے تو بندرنی پہلے بندر کے پاس لوٹ کر آ گئی۔ اور اس کے سر کے نیچے پھر اپنا ہاتھ آہستہ سے ڈالنا چاہا تا کہ کچھ پتہ نہ چلے، لیکن سوئے اتفاق کہ بندر بیدار ہو گیا، اور اس کو شک ہو گیا کہ بندرنی کسی اور جگہ سے آئی ہے، چنانچہ اس نے اپنے تئیں تحقیق کی، جب اس پر سارا معاملہ واضح ہو گیا تو ایک زوردار چیخ لگائی، جس سے کئی بندر جمع ہو گئے اور سب آپس میں شور کرنے اور چلانے لگے، اور بندرنی کی طرف اشارہ کرنے لگے، پھر کچھ ہی دیر کے بعد ہر طرف سے بندر آنا شروع ہو گئے، اور تھوڑی ہی دیر میں بندروں کا ایک خاصا مجمع ہو گیا، راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس بندرنی اور اس بندر کو لایا گیا جن کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا، پھر کئی بندروں نے ملکر گڑھا کھودا، گڑھا تیار ہو جانے کے بعد دونوں کو اس میں ڈال کر سنگسار کر دیا گیا:

"عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُوْنٍ قَالَ: كُنْتُ فِيْ الْيَمَنِ فِيْ غَنَمٍ لِأَهْلِي وَأَنَا عَلَى شَرَفٍ، فَجَاءَ قِرَدٌ مَعَ قِرَدَةٍ، فَتَوَسَّدَ يَدَهَا، فَجَاءَ قِرَدٌ

أَصْغَرُ مِنْهُ فَغَمَزَهَا، فَسَلَّت يَدَهَا مِنْ تَحْتِ رَأْسِ الْقِرَدِ الأَوَّلِ سَلًّا رَفِيقًا وَتَبِعَتْهُ، فَوَقَعَ عَلَيْهَا، وَأَنَا نَاظِرٌ، ثُمَّ رَجَعَتْ فَجَعَلَتْ تُدْخِلُ يَدَهَا تَحْتَ هٰذَا الأَوَّلِ بِرِفْقٍ، فَاسْتَيْقَظَ فَزِعًا، فَشَمَّهَا فَصَاحَ، فَاجْتَمَعَتِ الْقُرُودُ فَجَعَلَ يَصِيحُ وَيُومِي إِلَيْهَا بِيَدَيْهِ، فَذَهَبَ الْقُرُودُ يُمْنَةً وَيُسْرَةً، فَجَاءُوا بِذٰلِكَ الْقِرَدَ أَعْرِفُهُ، فَحَفَرُوا لَهُمَا حُفْرَةً فَرَجَمُوهُمَا"۔ (فتح الباری ۲۰۲/۷)

یہ تو واقعہ ہے، اب اس واقعہ پر معترضین نے جو اعتراض کیا ہے اس کا جواب کئی حضرات نے دیا ہے، ذیل میں اختصار کی غرض سے صرف چند حضرات کے جواب کو نقل کیا جاتا ہے:

۱۔ابن التین کا کہنا ہے کہ وہ بندر انسان کی نسل سے تھا، جن کو مسخ کر دیا گیا تھا، اور ان میں پہلے ہی جیسا حکم (رجم) باقی تھا، مگر یہ توجیہ صحیح معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ یہ تو ایک طے شدہ بات ہے کہ مسخ شدہ قوم کی نسل نہیں چلتی، پھر ان کی نسل کیسے چلی، اور اتنے بندر اس نسل سے وجود میں آئے، چنانچہ مسلم شریف میں بھی ہے کہ مسخ شدہ قوم کی نسل نہیں چلتی ہے۔ اسی وجہ سے ابن التین خود لکھتے ہیں:

قَالَ ابْنُ التِّيْنِ: لَعَلَّ هٰؤُلَاءِ كَانُوْا مِنْ نَسْلِ الَّذِيْنَ مُسِخُوْا فَبَقٰى فِيْهِمْ ذٰلِكَ الْحُكْمُ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ الْمَمْسُوخَ لَا يَنْسِلُ، قُلْتُ: وَهٰذَا هُوَ الْمُعْتَمَدُ، لِمَاثَبَتَ فِي صَحِيحِ مُسْلِمٍ۔ "إِنَّ الْمَمْسُوخَ لَا يَنْسِلُ لَه"۔

وَعِنْدَهُ مِنْ حَدِيثِ بْنِ مَسْعُودٍ مَرْفُوعاً إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُهْلِكْ قَوْمًا فَيَجْعَلُ لَهُمْ نَسْلاً۔ (فتح الباری ۲۰۲/۷)

جمہور کی جانب سے اعتراض مذکور کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس میں کوئی شک

نہیں کہ مسخ شدہ قوموں کی نسل نہیں چلتی، اس لئے آپ نے پورے جزم ویقین سے فرمایا کہ مسخ شدہ قوموں کی نسل نہیں چلتی، اور جن احادیث میں اس کا اثبات کیا گیا ہے وہ یقین کے ساتھ نہیں بیان کیا گیا ہے، گویا وحی کے نزول سے پہلے آپ کا یہ فرمان تھا، مگر وحی نازل ہونے کے بعد آپ نے یقین کے ساتھ فرمایا کہ مسخ شدہ قوموں کی نسل نہیں چلتی۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جمہور علماء کی ترجمانی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”وَاَجَابَ الْجَمْهُوْرُ عَنْ ذٰلِكَ، بِاَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذٰلِكَ قَبْلَ اَنْ يُوْحىٰ اِلَيْهِ بِحَقِيْقَةِ الاَمْرِ فِي ذٰلِكَ، وَلِذٰلِكَ لَمْ يَاتِ الْجَزْمُ عَنْهُ بِشَيٍ مِنْ ذَٰلِكَ، بِخِلَافِ النَّفْيِ فَاِنَّهُ جَزَمَ بِهٖ كَمَا فِيْ حَدِيْثِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ“۔ (فتح الباری ۷/۲۰۳)

ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ یہ تو بالکل صحیح ہے کہ مسخ شدہ انسانوں کی نسل نہیں چلتی، لیکن جب اللہ نے بنی اسرائیل کو بندروں کی صورت پر مسخ کر دیا تو وہ بندر دیگر موجود بندروں کے ساتھ رہنے سہنے لگے، کیونکہ دونوں میں صورۃً مشابہت تھی۔ جس کی وجہ سے اصلی بندر نے ان مسخ شدہ لوگوں کی معاشرت اختیار کر لی اور ان جیسی خوبیاں اپنانے لگے، ان کے بہت سے اخلاق واعمال کا ان پر گہرا اثر پڑا، یہی وجہ ہے کہ بندر بھی ہنستے ہیں، ناچتے ہیں، دیکھی ہوئی چیز کی نقل کرتے ہیں، ان میں غیرت بھی ہوتی ہے اور اسی کا یہ اثر بعض بندروں میں ہوا کہ وہ اپنی مخصوص بندرنی کے علاوہ دوسرے سے خواہشات کی تکمیل نہیں کرتے۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں تعزیری کارروائی بھی ہوتی ہو۔ اور اسی قبیل سے وہ واقعہ ہو جو حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے بہر حال حدیث کی تاویل مذکورہ انداز سے کر لی جائے تو

کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا۔(۱)

فَلَعَلَّ هٰؤُلَاءِ مِنَ الْجِنِّ لِأَنَّهُمْ مِنْ جُمْلَةِ الْمُكَلَّفِيْنَ (۲)

بعض حضرات (مثلاً حمیدیؒ) نے جواب دیا ہے کہ یہ روایت بخاری کے اصل نسخہ میں نہیں ہے، گویا یہ صحیح روایت نہیں ہے۔ لہٰذا مذکورہ سوال کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے، لیکن ابن حجرؒ اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ روایت بخاری کے اصل نسخہ میں ابھی موجود ہے جس کے راوی غریب ہیں، اور امت نے بالاتفاق ان کے نسخہ کو قبول کیا ہے۔(۳)

لہٰذا یہ جواب درست معلوم نہیں ہوتا، ماقبل کے جواب سے وہ شبہ اچھی طرح رفع ہوجاتا ہے، علماء نے اور جواب بھی دیئے ہیں، لیکن اختصار کی غرض سے اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

(۱) فتح الباری ۲۰۳/۷

(۲) فتح الباری ۲۰۳/۷

(۳) فتح الباری ۲۰۳/۷

حیاء ایمان کا شعبہ ہے

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ اَوْ بِضْعٌ وَسِتُّوْنَ شُعْبَةً فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِیْمَانِ"۔(۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''ایمان کے ستر شعبے ہیں (راوی کو شک ہے) یا ساٹھ شعبے ہیں، اس کا سب سے افضل شعبہ ہے لا الہ الا اللہ کہنا، اور اس کا ادنیٰ شعبہ ہے راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا، اور حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

اعتراض: اس روایت پر اعتراض یہ ہے کہ ایمان ایک کسبی چیز ہے، حیا ایک طبعی چیز ہے جو ہر انسان میں فطری طور پر موجود ہوتی ہے، پھر اس حیا کو ایمان کے شعبوں میں کیوں شامل کیا گیا؟ حیا کو ایمان کے ساتھ شامل کرنا اور اس کو ایمان قرار دینا عقلی اعتبار سے بہت ہی مستبعد معلوم ہوتا ہے؟ علامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

قَالُوْا: وَالْاِیْمَانُ اِکْتِسَابٌ، وَالْحَیَاءُ غَرِیْزَةٌ مُرَکَّبَةٌ فِی الْمَرْءِ،

---

(۱) مسلم لابی مسلم بن الحجاج القشیری النیساپوری متوفی ۲۶۱ھ فی رجب، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وافضلها وادناها وفضیلة الحیا وکونه من الایمان ۱/۴۷ ورواہ البخاری: ۱/۱۱، والادب المفرد۔ ۹۱۔ والمقاصد ۹۱۔

فَكَيْفَ تَكُوْنُ الْغَرِيْزَةُ اِكْتِسَابًا؟

جواب: اس سوال کا جواب مختلف علماء محدثین نے دیا ہے، لیکن چونکہ سوال عقلی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جواب بھی عقلی اعتبار سے ہی دیا جائے، سوال یہ تھا کہ ایمان تو ایک کسبی چیز ہے، جبکہ حیا ایک طبعی چیز ہے پھر اس طبعی شی کو ایمان کا ایک شعبہ کیوں قرار دیا؟

اس سوال کا ایک آسان اور واضح جواب یہ ہے کہ ایک باحیا انسان شرم وحیا کی وجہ سے معاصی سے ویسے ہی رکتا ہے اور ارتکاب معاصی سے اسی طرح گریز کرتا ہے جس طرح مومن اپنے ایمان کی وجہ سے معاصی وفواحش کے ارتکاب سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، گویا حیا ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے، اور اہلِ عرب بکثرت ایسی چیز کو جو اصل کے مثل ہو، یا اس کے مشابہ ہو یا اس کا سبب ہو تو اس پر اصل ہی کا اطلاق کر دیا کرتے ہیں۔

علامہ ابن قتیبہؒ نے بھی اس عقلی جواب کو اپنی کتاب ''تاویل مختلف الحدیث'' میں نقل کیا ہے، عبارت کے الفاظ اس طرح ہیں:

اِنَّ الْمُسْتَحْيِي يَنْقَطِعُ بِالْحَيَاءِ عَنِ الْمَعَاصِي كَمَا يَنْقَطِعُ بِالْاِيْمَانِ عَنْهَا فَكَاَنَّهُ شُعْبَةٌ مِنْهُ۔
وَالْعَرَبُ تُقِيْمُ الشَّيْءَ مُقَامَ الشَّيْ اِذَا كَانَ مِثْلَهُ، اَوْ شَبِيْهًا بِهِ، اَوْ كَانَ سَبَبًا لَهُ''۔ (تاویل مختلف الحدیث ص ۲۸۲)

اس جواب کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عربی زبان میں رکوع وسجود کا اطلاق صلاۃ پر کر دیتے ہیں، حالانکہ صلوۃ کے اصلی معنیٰ دعا کے ہیں، ایسے ہی دعا کو لفظ صلوۃ سے تعبیر کر دیتے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ہے ''وَصَلِّ عَلَيْهِمْ'' اى اُدْعُ

لَھُم ۔ ایسے ہی کبھی دعا کا لفظ استعمال کر کے صلوۃ مراد لے لیا جاتا ہے، قرآن میں ہے: "لَوْلَا دُعَائُکُمْ" اَیْ لَوْلَا صَلَاتُکُمْ"۔عبارت پر ایک نظر۔

"وَسَمَّوْا الدُّعَاءَ صَلٰوۃً کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ: "وَصَلِّ عَلَیْھِمْ"

(سور التوبة: ۱۰۳)

اَیْ: اُدْعُ لَھُمْ وَقَالَ تَعَالیٰ "لَوْلَا دُعَاءُ کُمْ" (سورة الفرقان: ۷۷)

غرض یہ کہ اس عبارت سے یہ بات بے غبار ہو جاتی ہے کہ عربی زبان میں اور خود قرآن کریم میں اس طرح کی نظیر موجود ہے۔ لہٰذا حدیث نبوی میں اگر حیا کو معاصی وفواحش کے ارتکاب سے بچنے کے باب میں ایمان کی طرح قرار دے دیا گیا ہے تو اشکال کی کوئی بات نہیں ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حیا دو طرح کی ہوتی ہے۔ (۱) حیاء طبعی (۲) حیاء عقلی۔ روایت میں حیاء عقلی مراد ہے، جو طبعی نہیں بلکہ کسبی ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا اشکال رفع ہو جاتا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ حیا کو جو ایمان کا شعبہ قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حیا اپنے ثمرات ونتائج کے اعتبار سے ایمان کا شعبہ ہے، نہ کہ نفس حیا، اور یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ حیا جو ایک طبعی اور فطری چیز ہے جو قبیح چیز سے اجتناب پر آمادہ کر دیتی ہے، وہ ایمان کا ایک ایسا شعبہ ہے جس کے نتیجے میں ایمان کے متعدد شعبے مرتب ہوئے ہیں، جیسا کہ روایت میں ہے، "اِذَا فَاتَكَ الْحَیَاءُ فَافْعَلْ مَاشِئْتَ"۔ بعض طرق سے یہ بھی مروی ہے۔ "إذَا لَمْ تَسْتَحْيِي فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ"۔ (۱)

اس روایت کا فارسی ترجمہ جو زبان زد ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔ "بے حیا باش

(۱) اخرجه البخاری ۱/۱۱۔ الادب المفرد

وہرچہ خواہی کن‘‘۔

اور یہ بات تو محقق ہے کہ جس آدمی کو حیا نہ ہو وہ عموماً فاسق وفاجر ہوتا ہے۔ ہر اس برائی کا ارتکاب کر لیتا ہے، جسے کوئی بھی سلیم الطبع اور شریف انسان اچھا نہیں سمجھتا، کیونکہ بے حیا شخص کے لئے معاصی سے رُکنے میں نہ دین مانع ہوتا ہے، نہ حیا، لیکن جب کسی میں حیا جیسی عظیم صفت ہو تو وہ شخص جھوٹ، چوری، زنا، سینما وفلم بینی اور ہر قسم کی برائیوں سے آسانی سے بچ سکتا ہے۔

اس لئے کہ جب حیا ہوگی تو وہ اس بات کے سوچنے پر مجبور ہوگا کہ اگر آئندہ کل کسی کے سامنے جھوٹ ظاہر ہوگیا تو کیا ہوگا؟ اگر کسی نے سنیما ہال میں دیکھ لیا تو کیا عالم ہوگا؟ اگر کسی شاگرد نے دیکھ لیا یا کسی معتقد کو پتہ چل گیا تو حالت کیا ہوگی؟ غرضیکہ حیا بہت سی برائیوں سے روکتی ہے، جس طرح ایمان معاصی سے روکتا ہے۔ گویا دونوں شی واحد ہیں۔

اَفَمَا تَرٰی! اَنَّ الْحَیَاءَ وَالِایْمَانَ یَعْمَلَانِ عَمَلًا وَاحِدًا فَکَاَنَّھُمَا شَیٌٔ وَاحِدٌ۔

جہنّم کا اپنے ربّ سے شکایت کرنا

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّه يَقُوْلُ: "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اِشْتَكَتِ النَّارُ اِلٰى رَبِّهَا فَقَالَتْ: رَبِّ اَكَلَ بَعْضِيْ بَعْضًا، فَاَذِنَ لَهَا بِنَفْسَيْنِ، فَاَشَدُّ مَاتَجِدُوْنَ مِنَ الْحَرِّ، وَاَشَدُّ مَاتَجِدُوْنَ مِنَ الزَّمْهَرِيْرِ"۔ (۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی کہ میرا بعض بعض کو کھا رہا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے دو سانس لینے کی اجازت دی، ایک سردی میں اور ایک گرمی میں۔ لہٰذا شدید ترین گرمی جہنم کی گرمی کا نتیجہ ہوتا ہے، نیز شدید ٹھنڈک جسے تم محسوس کرتے ہو وہ جہنم کا اثر ہے۔

اعتراض: اس روایت پر عقلی نقطۂ نظر سے دو قسم کے سوال پیدا ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ جہنم ایک بے جان چیز ہے اس میں قوت گویائی تو ہے نہیں پھر اس کا اپنے رب سے شکایت کرنے کا کیا مطلب ہے؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گرمی کی معروف ومشہور وجہ سورج کی تپش اور اس کی حرارت ہے، نیز سورج کا کرۂ ارض سے قریب ہونا اور دور ہونا ہے، جبکہ روایت

---

(۱) رواہ البخاری، باب صفة النا وانها مخلوقة۔ (رقم الحدیث ۳۲۶۰)

والترمذی: ابواب صفة الجنة، باب ماجاء ان للنار نفسین۔۔۔۔رقم ۲۵۹۲۔ ابن ماجة، ابواب الزهد، باب صفة النار، رقم الحدیث ۴۳۱۹۔

میں دنیا کی گرمی کو جہنم کی آگ کی گرمی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے؟

یہ سوال کہ جہنم ایک بے زبان شے ہے اس کا ایک جواب علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی معرکۃ الآراء تصنیف" تکملة فتح الملهم" کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔

اور ایک جواب قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ یہ شکایت جہنم نے زبان قول سے کی تھی، کیونکہ باری تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، لہٰذا وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ غیر ناطق کو ناطق بنادے، قاضی عیاض نے اسی جواب کو راجح قرار دیا ہے، امام نووی، علامہ تورپشتی اور قرطبی رحمہم اللہ کا بھی یہی خیال ہے کہ اس شکایت کو حقیقت پر محمول کیا جائے۔

بعض نے کہا کہ جہنم کے داروغہ نے درحقیقت یہ شکایت کی تھی، اسی کو النار سے تعبیر کردیا گیا ہے، اورعربی زبان میں اس قسم کے استعمالات بکثرت ہیں، قاضی بیضاوی نے کہا ہے کہ یہاں جہنم کے جوش مارنے کو مجازاً شکایت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فتح الملہم میں ہے:

وَقَدْ اُخْتُلِفَتْ فِي هٰذَا الشَّكْوٰى هَلْ هِيَ بِلِسَانِ الْحَالِ اَوْ بِلِسَانِ الْقَالِ قَالَ عِيَاضٌ بِلِسَانِ الْقَالِ وَهُوَ الْاَظْهَرُ وَ قَالَ الْقُرْطُبِيُّ لَا اِحَالَةَ فِي حَمْلِ اللَّفْظِ عَلٰى حَقِيْقَتِهٖ قَالَ وَاِذَا اَخْبَرَ الصَّادِقُ بِاَمْرٍ جَائِزٍ لَمْ يُحْتَجْ اِلٰى تَاوِيْلِهٖ وَقَالَ النَّوَوِيُّ نَحْوَ ذٰلِكَ ثُمَّ قَالَ حَمْلُهُ عَلٰى حَقِيْقَةٍ هُوَ الصَّوَابُ وَقَالَ نَحْوَ ذٰلِكَ تُوْرُبُشْتِيُّ وَرَجَّحَ الْبَيْضَاوِيُّ حَمْلَهُ عَلٰى الْمَجَازِ فَقَالَ شِكْوَاهَا مَجَازٌ عَنْ غَلِيْظٍ مِنْهَا وَ اَكْلُ بَعْضِهَا بَعْضًا مَجَازٌ عَلٰى اِزْدِحَامِ اَجْزَائِهَا وَنَفْسُهَا مَجَازٌ عَنْ خُرُوْجِ مَا

يَبْرُزُ مِنْهَا۔ (فتح الملہم ج۲،ص:۱۹۹)

اس کے علاوہ مزید تفصیلات کے لئے فتح الباری اور فتح الملہم کی طرف رجوع کرنا چاہیے، زمہریر سے متعلق بحث کے لئے فتح الملہم کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

اعتراض کی دوسری شق تھی کہ گرمی کی معروف وجہ سورج کا کرہ ارض سے قریب ہونا اور دور ہونا ہوتا ہے، جبکہ حدیث میں دنیا کی گرمی کو جہنم کی آگ کی گرمی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے؟

اس سوال کا جواب صاحب فتح الملہم مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی دیا ہے، ان کے علاوہ العرف الشذی میں مختصر مگر جامع جواب دیا گیا ہے، تحفۃ الاحوذی کے حوالہ سے ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا مبارکپوری لکھتے ہیں:

قَالَ صَاحِبُ الْعُرْفِ الشَّذِيّ مَا لَفْظُهُ :هٰهُنَا سُوَالٌ عَقْلِيٌّ وَهُوَ أَنَّ التَّجْرِبَةَ أَنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ وَضُعْفَهَا بِقُرْبِ الشَّمْسِ وَبُعْدِهَا فَكَيْفَ كَانَ شِدَّةُ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ قَالَ فَنُجِيْبُ بِمَا يُفِيْدُ فِيْ مَوَاضِعَ عَدِيْدَةٍ فَهُوَ لِلْأَشْيَاءِ أَسْبَابٌ ظَاهِرَةٌ وَبَاطِنَةٌ وَالْبَاطِنَةُ تَذْكُرُهَا الشَّرِيعَةُ وَالظَّاهِرَةُ لَا تَنْفِيْهَا الشَّرِيْعَةُ فَكَذٰلِكَ يُقَالُ فِيْ الرَّعْدِ وَالْبَرْقِ وَالْمَطَرِ وَنَهْرِ سِيْحَانِ شَتّٰى۔[1]

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ہر چیز کے دو سبب ہوتے ہیں، ایک ظاہری اور ایک باطنی، شریعت سبب باطنی بیان کرتی ہے اور ظاہری سبب کی نفی نہیں کرتی، اس روشنی میں اگر گرمی جہنم کے سانس لینے کی وجہ سے ہے تو کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔

---

(۱) تحفۃ الاحوذی باب ماجاء فی تاخیر الظھر فی شدۃ الحر ج۱،ص:۴۱۴

جہنّم میں کافروں کا جسم پھول کر بڑا ہو جائے گا

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَا بَیْنَ مَنْکَبَیِ الْکَافِرِ فِی النَّارِ مَسِیْرَةُ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ لِلرَّاکِبِ الْمُسْرِعِ۔[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کافر کے مونڈھوں کے درمیان کا فاصلہ اتنا زیادہ ہوگا کہ تیز رفتار سوار کو بھی اسے طے کرنے میں تین دن لگیں گے۔

اعتراض: اس روایت کو تنقید کا نشانہ اس لئے بنایا گیا کہ اعضاء کا اتنا بڑا ہونا بہت سے لوگوں کو سمجھ میں نہ آسکا، چنانچہ اسی وجہ سے انہوں نے اس روایت کی صحت کو مشکوک قرار دیا ہے۔

جہنّم میں کافروں کے اعضاء کے بڑے ہونے کی ایک عقلی وجہ:

مشاہدات و تجربات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ عموماً ظرف کے اعتبار سے ہی مظروف ہوتا ہے، یعنی جتنا بڑا ظرف ہوگا اسی کے بقدر مظروف یعنی وہ چیز ہوگی جو اس میں رکھی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی آدمی آدھا کلو گوشت پانچ من

(۱) رواہ مسلم: باب صفة النار۔۔۔ رقم الحدیث ۱۵۸۲

والبخاری: باب صفة الجنة والنار۔ رقم الحدیث ۳۶۷۳

مشکوۃ المصابیح، ۲/۶۵۳، مرقاہ المفاتیح۔

والی دیگ میں پکائے تو اس شخص کو باؤلا اور سر پھرا ہی کہا جائے گا، بعینہ یہی حالت انسان کی ہے، جیسا کہ یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اولاً انسان منی کا قطرہ تھا، لہٰذا اس کے بقدر اس کا ظرف اور مسکن بھی تھا یعنی صلب کا سراخ، پھر جب وہی منی کا قطرہ رحم مادر میں آیا تو اسی کے بقدر انسان بڑھا، پھر رحم مادر میں انسان بڑھتا رہا، بڑھتا رہا، حتیٰ کہ ایک دن آیا کہ ماں نے اس کو جن دیا، اب ظاہر ہے کہ زمین اور دنیا رحم مادر سے کافی بڑی اور وسیع ہے، لہٰذا انسان اس دنیا کے اعتبار سے اور زیادہ بڑا ہوا، اس کے اعضا پھیلے اور موٹے ہوئے حتیٰ کہ ایک لمبا تڑنگا، ڈیل ڈول والا ہو گیا، پھر جب انسان اس دنیا سے کوچ کر کے آخرت کی طرف جائے گا تو آخرت (جو ظرف ہے اور انسان مظروف) تو دنیا سے کئی گنا بڑی اور وسیع ہے، اس لئے عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اسی اعتبار سے مظروف یعنی انسان کے اعضا بھی بڑے ہو جائیں، اس دلیل کی مزید وضاحت کے لئے ''انڈا'' کی مثال بھی ممدود و معاون ثابت ہوگی کہ انڈا کتنا چھوٹا ہے، اس کے اندر مظروف یعنی بچہ ہوتا ہے جو انڈے کے بقدر ہی ہوتا ہے لیکن جب یہی بچہ باہر آتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا ظرف اب دنیا ہو گئی، لہٰذا اسی اعتبار سے بچہ بھی خوب بڑھتا ہے حتیٰ کہ بعض مرتبہ ایک معمولی سا بچہ دس دس کلو کے وزن کا ہو جاتا ہے، یہاں بھی ظرف مظروف کا فرق ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی اعضاء کا جہنم میں بڑا ہو جانا ہے۔

جہاں تک بات رہی کہ کفار کے اعضاء ہی کیوں بڑے ہوں گے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تاکہ ازدیاد عذاب کا باعث ہو، کہ کفار دنیا میں سب سے بڑے گناہ کفر میں مبتلا رہے، اور کفر و شرک کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ

بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ"۔ (نساء:۴۸)

جواب: کسی صحیح العقیدہ مسلم قوم کو اس پر تعجب اور حیرت بالکل نہیں ہونی چاہیے، اس لئے کہ ہم تمام لوگوں کا اس پر ایمان وایقان ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قادر مطلق ہے اور مختار کل ہے وہ رائی کو پربت اور پربت کو رائی بھی بنا سکتا ہے، جہاں تک بات رہی کافروں کے اعضاء کے بڑے ہوجانے کی تو اس میں حکمت یہ ہے کہ عذاب کو زیادہ سے زیادہ محسوس کرسکیں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا یہی خیال ہے:

"يُزَادُ فِيْ مِقْدَارِ اَعْضَاءِ الْكَافِرِ زِيَادَةً فِيْ تَعْذِيْبِهٖ بِسَبَبِ زِيَادَةِ الْمُمَاسَّةِ لِلنَّارِ"۔[1]

ایک روایت میں ہے:

"غِلَظُ جِلْدِ الْكُفَّارِ وَكَثَافَةُ جِلْدِهٖ اِثْنَانِ وَاَرْبَعُوْنَ ذِرَاعاً بِذِرَاعِ الْجَبَّارِ"[2]

"کافروں کے کھال کی موٹائی بیالیس ہاتھ کردی جائے گی، اور وہ بھی بڑے آدمی کے ہاتھ سے"۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بھی اس مضمون کی روایات منقول ہیں، جیسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، ان کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

"يَعْظُمُ اَهْلُ النَّارِ فِي النَّارِ حَتّٰى بَيْنَ شَحْمَةِ اُذُنِ اَحَدِهِمْ اِلٰى

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح ۱۰/۳۹۵۔ تحفة الاحوذی ۷/۲۵۲۔ فتح الباری، باب صفة الجنة والنار، والنار مخلوقة رقم الحدیث ۲۷۶۳

(۲) رواہ ابن المبارك فی زوائد زهد، رقم ۲۳۰۳۔ التذكرة فی احوال الموتى واصول الاخر ۲/۳۰۹

عَاتِقِهِ مَسِيْرَةَ سَبْعِ مِائَةِ عَامٍ" (فتح الباری ۱۱/۳۴۵)

"جہنمیوں کو جہنم میں اتنا بڑا کر دیا جائے گا کہ ان کے کان کی لو، اور کندھوں کے درمیان کا فاصلہ سات سو سال کی مسافت کا ہوگا"۔

اس مضمون کی اور روایات فتح الباری، مرقاۃ المفاتیح میں موجود ہیں۔[1]

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح ج۱، ص:۵۵۴

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّه قَالَ: "قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ"[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی شکل پر پیدا فرمایا۔

اعتراض: یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ پاک کے مثل کوئی چیز نہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خود اعلان کر دیا "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ"، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے مثل دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے، اور مذکور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا؟

روایت پر تنقید کی وجہ یہی ہے کہ مستشرقین نے روایت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ، اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا، جبکہ قرآن کریم کہتا ہے "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ"؟

علماء محدثین نے حدیث مذکور کی مختلف تاویلات کی ہیں:

---

(۱) رواه البخاري، كتاب الاستئذان، باب بدء السلام، رقم الحديث۔ ۶۲۲۷

مسلم: باب حسن سيرة اهل الجنة (رقم الحديث ۵۵۷۲)

مسلم: باب البر والصلة، باب الجنة

بعض حضرات نے کہا کہ حدیث کا مطلب یہ ہے "اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَۃٍ مِنْ عِنْدِہٖ" یعنی اللہ نے آدم علیہ السلام کو اس صورت پر پیدا کیا جو پہلے سے اللہ پاک کے پاس متعین تھی، مطلب یہ ہوا کہ اللہ پاک نے پہلے ایک فرما بنالیا ہوگا پھر اسی فرمے اور سانچے کے مطابق آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ہوگی۔

لیکن ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے اس تاویل کو غلط قرار دیا ہے:

"وَھٰذَا لَا یَجُوْزُ لِاَنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ لَا یَخْلُقُ شَیْئاً مِنْ خَلْقِہٖ عَلٰی مِثَالٍ"۔ (تاویل مختلف الحدیث ص ۲۵۸)

بعض علماء متکلمین کے خیال کے مطابق حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے آدم کو آدم علیہ السلام کی صورت پر پیدا کیا۔

لیکن اس تاویل کا بھی کوئی فائدہ نہیں، کیوں کہ یہ بات تو محقق ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو اس کی صورت پر پیدا کیا ہے اور جانوروں کی تخلیق اور اس کی تصویر اللہ پاک نے ان کے مطابق بنائی، کسی انسان کی شکل وشباہت پر اس کو نہیں ڈھالا، بعینہ اسی طریقہ سے جب آدم علیہ الصلوۃ والسلام کو ان کی شکل پر پیدا کیا تو اس میں حیرت واستعجاب کی کیا بات ہے؟

لیکن اس توجیہ کو تسلیم کرنے میں یہ دقت بھی پیش آتی ہے کہ بعض روایات میں صراحۃً ضمیر کا مرجع متعین ہے اور وہ مرجع ہے "رَحْمٰنْ" یعنی "اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَۃِالرَّحْمٰنِ"۔

یہاں پھر وہی سوال عود کر آئے گا کہ اس توجیہ کو ماننے میں خالق کی مخلوق کے ساتھ مشابہت لازم آئے گی، اور ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں ہے، متشابہات کے سلسلے میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ اس میں علماء متقدمین ومتاخرین کا اختلاف ہے، چنانچہ

علماء متقدمین یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی روایات پر ایمان لانا ضروری ہے، تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، اور نہ ہی اس کی کیفیت وکمیت جاننے کی حاجت ہے، جیسا کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

"اَمَّا مَعْنٰی حَدِیْثِ الصُّورَۃِ فَنَرُدُّ عِلْمَهُ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، وَنَسْکُتُ کَمَا سَکَتَ السَّلَفُ مَعَ الْجَزْمِ بِاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ"۔ (میزان الاعتدال ۲/۳۷)

ترجمہ: "اس حدیث کے اصل مفہوم سے اللہ اور اس کے رسول ہی واقف ہیں ہمارے لئے اس سلسلے میں سلف کی طرح خاموش رہنا ہی بہتر ہے، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ جیسا کچھ بھی نہیں"۔

اس روایت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ اللہ اور اس کے رسول ہی واقف ہیں، بن قتیبہ رحمہ اللہ نے بھی اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے:

قَالَ اَبُوْ مُحَمَّدٌ: وَالَّذِیْ عِنْدِیْ "وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ اَنَّ الصُّوْرَۃَ لَیْسَتْ بِاَعْجَبَ مِنَ الْیَدَیْنِ، وَالْاَصَابِعِ، وَالْعَیْنِ، وَاِنَّمَا وَقَعَ الْاِلْفُ لِتِلْكَ لِمَجِیْئِهَا فِی الْقُرْآنِ، وَوَقَعَتِ الْوَحْشَۃُ مِنْ هٰذِهٖ، لِاَنَّهَا لَمْ تَاْتِ فِی الْقُرْآنِ، وَنَحْنُ نُؤْمِنُ بِالْجَمِیْعِ، وَلَا نَقُوْلُ فِیْ شَیْءٍ مِنْهُ بِکَیْفِیَّۃٍ وَلَا حَدٍّ"۔ (تاویل مختلف الحدیث ص ۲۵۷)

علامہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حدیث میں لفظ صورۃ کا ذکر، ہاتھ (ید)، انگلی (اصابع) اور آنکھ (عین) وغیر کے ذکر سے زیادہ مختلف نہیں ہے، بس فرق صرف اتنا ہے کہ یہ چیزیں قرآن میں مذکور ہونے کی وجہ سے مانوس لگتی ہیں، جبکہ لفظ صورۃ کا ذکر اس طرح نہیں ہوا ہے، اس لئے یہ لفظ ذرا غیر مانوس سا لگتا ہے، بہرحال! اس کے صحیح ہونے پر ہمارا ایمان وایقان ہے۔

متاخرین علمائے حدیث کا آیات متشابہات واحادیث متشابہات میں مسلک یہ ہے کہ اس قسم کی روایتوں میں ایسی مناسب تاویل کی جائے جس سے حدیث کا معنی اس طرح متعین ہوجائے جو زبان وعقل اور شریعت کے ساتھ ہم آہنگ ہو، چنانچہ حدیث میں "صورتہ" کا مطلب ہوگا "صفتہ" یعنی اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صفات یعنی حیاۃ، علم، سماعت، بصارت وغیرہ پر پیدا کیا۔

لفظ صورۃ کے مختلف معانی ہیں، ان ہی میں سے ایک معنی صفت کے بھی ہیں، جیسا کہ ابن اثیر نے بیان کیا ہے کہ لفظ "صورۃ" کلام عرب میں کبھی کبھی حقیقت شئی وماہیت شئی کے لئے بولا جاتا ہے اور کبھی صورت کا استعمال "صفت" کے معنی کے لئے بھی ہوتا ہے، جیسا کہ ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوجاتی ہے، چنانچہ علامہ ابن منظور صاحب لسان العرب رقمطراز ہیں:

قَالَ ابْنُ الاَثِيرِ: اَلصُّورَةُ تُرَدُّ فِي كَلَامِ الْعَرَبِ عَلَى ظَاهِرِهَا وَعَلَى مَعْنَى حَقِيقَةِ الشَّيْءِ وَهَيْئَتِهِ وَعَلَى مَعْنَى صِفَتِهِ يُقَالُ: صُورَةُ النَّعْلِ كَذَا وَكَذَا اَيْ هَيْئَتُهُ، وَصُورَةُ الاَمْرِ كَذَا وَكَذَا اَيْ صِفَتُهُ، فَيَكُونُ الْمُرَادُ بِمَا جَاءَ فِي الْحَدِيثِ اَنَّهُ اَتَاهُ فِي اَحْسَنِ صِفَةٍ، وَيَجُوزُ اَنْ يُجَرَّدَ الْمَعْنَى اِلَى النَّبِيِّ اَتَانِي رَبِّي وَاَنَا فِي اَحْسَنِ صُورَةٍ"۔ (۱)

لسان العرب کے علاوہ ترتیب القاموس، اور لغات القرآن میں بھی صورت صفت کے معنی میں آیا ہے۔ (۲)

صاحب لغات القرآن علامہ عبد الرشید نعمانی حدیثِ مذکور میں وارد لفظ

---

(۱) لسان العرب لابن منظور، ۴۳۸/۷

(۲) ترتیب القاموس المحیط، مظاہر احمد، ۸۶۶/۲ بلفظ "تستعمل الصورۃ بمعنی النوع والصفۃ"۔

"صورتہ" کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہاں صورت سے انسان کی وہ مخصوص ہیئت مراد ہے کہ جس کا بصر سے ادراک ہوتا ہے اور بصیرت سے بھی، اور جس کے ذریعہ اللہ نے اسے اپنی اور بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا کی، اور صورۃ کی اضافت حق کی طرف بر بناء ملکیت ہے نہ کہ بر سبیل بعضیت وتشبیہ کہ اللہ پاک کی ذات اس سے مبرا ہے، بلکہ یہ اس صورت کے شرف کے لئے ہے، جیسا کہ بیت اللہ میں بیت کی اضافت اللہ کی طرف ہے، دوسری مثال ناقۃ اللہ، اللہ کی اونٹنی"۔ (۱)

مفردات القرآن کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ فَالصُّورَۃُ اَرَادَ بِهَا مَاخُصَّ الْاِنْسَانُ بِهَا مِنَ الْهَيْئَةِ الْمُدْرَكَةِ بِالْبَصَرِ وَالْبَصِيْرَةِ بِهَا فَضَّلَهُ عَلٰی كَثِيْرٍ مِنْ خَلْقِهٖ وِاِضَافَتِهٖ اِلَى اللّٰهِ عَلٰی سَبِيْلِ الْمِلْكِ لَا عَلٰی سَبِيْلِ الْبَعْضِيَّةِ وَالتَّشْبِيْهِ، تَعَالٰی عَنْ ذٰلِكَ، وَذٰلِكَ عَلٰی سَبِيْلِ التَّشْرِيْفِ لَهٗ، كَقَوْلِهٖ بَيْتُ اللّٰهِ، نَاقَةُ اللّٰهِ" وَنَحْوِ ذٰلِكَ، "وَنَفَخْتُ مِنْ رُّوْحِيْ"۔ (۲)

اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ "صورۃ" بمعنی صفت بھی کلام عرب میں مستعمل ہے۔

---

(۱) لغات القرآن ۴/۴۳- لسان العرب ۷/۴۳۸

(۲) مفردات القرآن- (لابی القاسم الحسین بن محمد المعروف، الراغب الاصفهانی) ۲/۳۷۹

بخار جہنّم کی آگ میں سے ہے

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "اَلْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ۔ فَاَبْرِدُوْهَا بِالْمَاءِ"۔ (۱)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں:
کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بخار جہنم کی آگ میں سے ہے، اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔

اعتراض: روایت مذکورہ کو تنقید کا نشانہ اس لئے بنایا گیا کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "بخار جہنم کی حرارت کا حصہ ہے، اس لئے اسے پانی سے ٹھنڈا کرو" جبکہ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ بخار والا آدمی اگر ٹھنڈا پانی استعمال کرے گا تو

(۱) رواہ البخاری، کتاب الطب، باب الحمی من فیح جهنم، رقم الحدیث:۵۷۲۳، و کتاب بدء الخلق، باب صفة النار۔ رقم الحدیث :۳۲۶۲ بلفظ۔ "الحمی من فور جهنم"۔
ومسلم، کتاب السلام، باب لکل داء دواء، واستحباب التداوی، رقم الحدیث:۲۲۱۰، ۲۲۱۱ والنسائی فی الکبری: کتاب الطب، باب الحمی من فیح جهنم۔تحفة الاشراف (۱۱/۱۵۷۴۴ نقلاً مسند الجامع) مسند الجامع ۳۶/۱۔
مجمع الزوائد للهیثمی، کتاب الطب، باب ما جاء فی الحمی وابرادها بالماء، رقم الحدیث:۸۵۱/۵۸۳۴۲۔ سنن دارمی ۲۲۴/۲۔ رقم الحدیث :۲۷۷۲.
مسند احمد بلفظ: "فابردوها بماء زمزم" ۳۶۱/۱۔ ۲۱/۲۔ ۱۴۱/۴ ابن ماجة، رقم الحدیث: ۳۴۷۱ والموطا لمالکؒ، رقم: ۵۸۶ البزار :۳۰۲۷، ابو یعلی رقم:۳۷۹۴

اُسے نمونیہ ہو جائے گا اور ہلاکت کے قریب ہو جائے گا، اس لئے کہ (بخار کی حالت میں) پانی ڈالنے سے مسام بند ہو جائیں گے، اور بخار رک جائے گا اور حرارت (یعنی بھاپ) جسم کے اندرونی حصہ کی طرف جائے گی۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ نے بھی اس اعتراض کو اپنی کتاب ''معالم السنن شرح ابی داوٗد'' میں نقل کیا ہے۔

"قَالَ الْخَطَّابِیُّ وَمَنْ تَبِعَهُ اِعْتَرَضَ بَعْضُ سُخَفَاءِ الاَطِبَّاءِ عَلٰی هٰذَا الْحَدِیْثِ بِاَنْ قَالَ: اِغْتِسَالُ الْمَحْمُوْمِ بِالْمَاءِ خَطَرٌ یُقَرِّبُهُ مِنَ الْهَلَاكِ، لِاَنَّهُ یَجْمَعُ الْمَسَامَ وَیَحْتَقِنُ الْبُخَارَ وَیَعْكِسُ الْحَرَارَةَ اِلٰی دَاخِلِ الْجِسْمِ فَیَكُوْنُ ذٰلِكَ سَبَبًا لِلتَّلَفِ"

(فتح الباری ۱۰/۲۱۶)

اعتراض کا دوسرا رخ یہ ہے کہ بخار کو جہنم کی آگ کی گرمی کا نتیجہ کیسے قرار دیا گیا ہے جبکہ دوزخ کی آگ اور اس کی حرارت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دنیا کی آگ جو ہمیں جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، جبکہ یہ آگ تو دوزخ کی آگ کے مقابلہ میں بہت ہی معمولی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں، پھر بخار کو فیح جہنم کہنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: (۱) معترض کا یہ اعتراض ان کی کم علمی وعدم تجربہ کی واضح علامت ہے، ایسے معترض کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ آپ کو جب بخار ہو تو آپ پانی میں ڈبکی لگائیے پھر دیکھئے اندرونی حرارت بند ہوتی ہے یا نہیں؟ اس کے بعد آپ کو حدیث مذکور پر شوق سے اعتراض کرنے کا حق ہوگا،...... یہ جواب تو سائل کی ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے دیا گیا ہے ویسے اس کا تفصیلی اور تحقیقی جواب آگے آ رہا ہے۔

علامہ مازری رحمہ اللہ نے بھی مذکورہ حدیث کی توجیہ بیان کی ہے، ہم اس توجیہ کو فتح الباری کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ علامہ مازری رحمہ اللہ کی توجیہ کا حاصل یہ ہے کہ:

اس بات میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ علمِ طب کے بہت سے گوشے تفصیل طلب ہیں، چنانچہ یہ بات بہت مشہور ہے کہ مختلف لوگوں کے احوال کے اختلاف سے موسم کے تغیر وتبدل کی بنیاد پر علاج میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے، مثلاً کسی خاص مریض کے لئے کوئی خاص نسخہ اور دوا تجویز کی گئی جس سے اسے شفا اور عافیت بھی ہوگئی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ نسخہ ہر ایک کے لئے ہر حالت میں شفاء کا باعث ہوگا، بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ نسخہ تکلیف کا ذریعہ بن جائے، کیونکہ اطباء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک ہی مرض کے مختلف علاج ہوتے ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے ماہرینِ طب کے اسی اتفاق کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”وَالاَطِبَّاءُ مُجْمِعُوْنَ عَلٰی اَنَّ الْمَرَضَ الْوَاحِدَ یَخْتَلِفُ عِلَاجُهُ بِاخْتِلَافِ السِّنِّ وَالزَّمَانِ وَالْعَادَةِ وَالْغِذَاءِ الْمُتَقَدِّمِ وَالتَّاثِیْرِ الْمَاْلُوْفُ“۔ (فتح الباری ۱۰/۲۱۷)

ایک توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مخصوص لوگوں، مخصوص جگہوں اور مخصوص بخار کے لئے ہو، عام نہ ہو، حافظ رحمہ اللہ نے اس توجیہ کو راجح قرار دیا ہے، اور وجہ ترجیح بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ چونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب عموماً دو طرح کا ہوتا تھا، اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب عام ہوا کرتا تھا، اور کبھی کبھی آپ خطاب خاص بھی فرماتے تھے جیسے: ”لَا تَسْتَقْبِلُوْا الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ وَلَا بَوْلٍ وَلٰکِنْ شَرِّقُوْا اَوْ غَرِّبُوْا“۔ (۱)

(۱) فتح الباری ۱۰/۲۱۷

آپ کا یہ حکم "شَرِّقُوْ اَوْ غَرِّبُوْا" تمام لوگوں کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو مدینہ منورہ میں یا مدینہ کی سمت میں رہتے ہیں۔ (۱)

۵۔ امام ابوبکر رازی رحمہ اللہ نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ آدمی جب لحیم وشحیم ہو اور اسے بخار لاحق ہو جائے اور بخار بھی انتہائی سخت ہو (جس کو ہم ایک سو پانچ ڈگری بخار جو بخار کی آخری حد ہے اس کے بعد خطرہ رہتا ہے کہہ سکتے ہیں) ایسے بخار زدہ شخص کو ٹھنڈے پانی سے ٹھنڈک پہنچانا کافی سود مند ثابت ہوگا، ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ایسے ہی انسانوں کے لئے ہو۔

یہ سارے جوابات تو اس صورت میں ہیں جبکہ ہم سائل کے اعتراض "بخار زدہ شخص کو پانی دینا نمونیہ کا باعث بلکہ ہلاکت کا باعث ہوتا ہے" کو تسلیم کریں، لیکن اگر ہم ان کے مذکورہ اعتراض کو تسلیم ہی نہ کریں (جیسا کہ جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بخار زدہ شخص کو ٹھنڈے پانی سے ٹھنڈک و برودت پہنچانا کافی سود مند ہوتا ہے) تو جواب دینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ جدید سائنس نے آپ کے فرمان کو سائنٹفک تجربات ومشاہدات کی روشنی میں سچ کر دکھایا ہے...... ہم اسلام اور میڈیکل سائنس کے حوالہ سے بخار سے متعلق جدید تحقیق کو مختصراً بیان کرتے ہیں:

بخار جس کو عربی میں حمی، اور انگلش میں (fever) کہتے ہیں، یہ بخار مختلف بیماریوں کی علامت ہے، جو ہر ملک میں اور خطہ میں بلا قیدِ عمر لاحق ہوا کرتا ہے۔

ویسے تو بخار کی درجنوں قسمیں ہیں اور دسیوں اسباب ہیں (جیسا کہ حافظ ابن

---

(۱) زاد المعاد ۴/ ۲۵-۲۶-۲۷

حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری میں بیان فرمایا ہے) مگر گرم ممالک میں گرمی کی شدت اور لو لگنے سے بخار کا درجہ حرارت بلند ہو جاتا ہے جس سے دماغ اور اس کی جھلیاں متاثر ہو کر مریض کو ''سن اسٹروک'' ہو جاتا ہے، قے، دست اور بے ہوشی عام ہے، جس کو ''سرسام منجائٹس'' کہتے ہیں، یہ ایک خطرناک علامت ہے اور آج بھی اس کے علاج میں سب سے بہتر اور ضروری تدبیر تبرید (cold commpression) کرنا ہے جس سے فوری افاقہ ہوتا ہے اور مریض کا بخار کم بھی ہوتا ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی سادہ اور ضروری علاج آج سے چودہ سو سال پہلے ہی اپنی خداداد صلاحیت کی بنیاد پر تجویز فرما دیا تھا۔

مشاہدات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تیز بخار زدہ شخص کو ٹھنڈک پہنچانا کافی فائدہ مند ہوتا ہے، جیسا کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی (جبکہ لوگ ترقی کرتے کرتے چاند پر پہنچ گئے ہیں، ستاروں پر کمندیں ڈال دی ہیں، امریکہ جنگی وسائنسی ایجادات کا مرکز بن چکا ہے، غرضیکہ جدید سائنس نے اتنی ترقی کی کہ آج کے دور کو بجا طور پر سائنٹفک تجربات اکتشافات اور تحقیقات کا دور کہا جاسکتا ہے)۔ تیز بخار کی صورت میں تشخیص سے پہلے بخار کو فوری کم کرنا انتہائی ضروری ہے، جس کے لئے مریض کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اور کولڈ اسپنج (Cold speng) اور کولڈ کنڈیشن (cold condition) میں رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے...... اسی کے لئے فوری اور آسان علاج فرمودات نبوی اور طبِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہر وقت ہر دم ملے گا، جیسا کہ مذکورہ روایت میں آپ نے (بخار زدہ شخص کو ٹھنڈک پہنچاؤ) ارشاد فرمایا، یہ جان بچانے کے لئے پہلی اور ایسی آسان تدبیر ہے، جس کی صداقت پر

سائنس بھی حیران وششدر ہے۔[1]

اس جدید تحقیق کی تائید بعض علماء متقدمین اور بعض ماہرین طب کے قول سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ علامہ ملا علی قاریؒ نے ''مرقاۃ المفاتیح'' میں اس جدید تحقیق کو نقل کیا ہے:

وَقَالَ بَعْضُ الشُّرَّاحِ اَیْ اَسْقُوْا الْمَحْمُوْمَ الْمَاءَ لِیَقَعَ بِهٖ التَّبْرِیْدُ وَقَدْ وُجِدَ فِی کَلَامِ بَعْضِ الْاَطِبَّاءِ الْمُتَقَدِّمِیْنَ اَنَّ ذٰلِكَ اَنْفَعُ الْاَدْوِیَةِ وَاَنْجَحِهَا فِی التَّبْرِیْدِ عَنِ الْحُمَّاتِ الْحَارَّةِ لِاَنَّ الْمَاءَ مُنْسَاغٌ لِسَهُوْلَةٍ فَیَصِلُ اِلٰی اَمَاکِنِ الْعِلَّةِ وَیَدْفَعُ حَرَارَتَهَا عَنْ غَیْرِ حَاجَةٍ اِلٰی مُعَاوِنِهِ الطَّبِیْعَةِ۔[2]

اعتراض کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ بخار (حرارت) کو جہنم کی گرمی کا نتیجہ کیسے قرار دیا گیا؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں میں ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ یہاں دراصل تشبیہ دینا مراد ہے یعنی بخار کی حرارت کو نار جہنم سے اس بات میں تشبیہ دینا مراد ہے کہ بخار نار جہنم کی نشانی اور نمونہ ہے، نہ یہ کہ بخار جہنم کی آگ کا ہی حصہ ہے۔

۲۔ دوسری توضیح یہ ہے کہ ''بخار کی نسبت جہنم کی لپٹ کی طرف'' یہ حقیقت پر محمول ہے، یعنی بخار کی حرارت جہنم سے ماخوذ ہے، اور بخار زدہ شخص کے جسم میں جو حرارت کا شعلہ ہے وہ جہنم کا ایک حصہ ہے، او یہ اس لئے تاکہ منکرین کے لئے انذار کا

---

(۱) اسلام اور میڈیکل سائنس ص ۶۷، سنت نبوی اور جدید سائنس ۲/ ۲۳۶

(۲) مرقاۃ المفاتیح ۸/ ۳۴۷

باعث ہو اور عبرت حاصل کرنے والے مومنین کے لئے بشارت کا باعث ہو کیونکہ بخار گناہوں کا کفارہ ہے جیسا کہ روایت بھی ہے۔ (۱)

مرقاۃ المفاتیح میں ہے:

"اُرسِلَتْ اِلَی الدُّنْیَا نَذِیْرًا لِلجَاحِدِیْنَ وَبَشِیْراً لِلْمُعتَبِرِیْنَ لِاَنَّهَا کُفَّارَۃٌ لِذُنُوبِهِمْ" (۲)

۳۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے پہلے جواب کی تردید فرمائی ہے انہوں نے کہا ہے کہ یہاں پر تشبیہ مراد نہیں ہے کیونکہ تشبیہ کا قول اس وقت صحیح ہوتا جبکہ "اَلْحُمّٰی مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ" میں "من" بیانیہ ہوتا، جبکہ یہاں پر "من" بیانیہ نہیں ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ من بیانیہ نہیں ہے تو پھر کونسا "من" ہے؟ جواب یہ ہے کہ من کے سلسلے میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہ ابتدائیہ ہے "اَیْ حَصَلَتْ وَنَشَاَتْ مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ" یعنی بخار جہنم کی پیداوار ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ "من" تبعیضیہ ہو، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ بخار کی حرارت وتپش یہ جہنم کا بعض حصہ ہے، اس توجیہ کی دلیل بیان کرتے ہوئے علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ توضیح دوم کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ "جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی کہ میرا بعض بعض کو کھا رہا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے دو سانس لینے کی اجازت دی، ایک سردی میں، ایک گرمی میں"، (اس روایت کی تخریج اور اس پر کلام ماقبل میں گزر چکا)۔ تو جس طریقہ سے شدید گرمی کی حرارت وتپش جہنم کی حرارت کا حصہ ہے ایسے ہی بخار بھی جہنم کی حرارت کا ایک حصہ ہے۔ (۳)

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح ۸/ ۳۴۷ (۲) مرقاۃ المفاتیح ۸/ ۳۴۷

(۳) مرقاۃ المفاتیح ۸/ ۳۴۷ (۴) زاد المعاد ۴/ ۲۶ (مزید تفصیل کے لئے مرقاۃ المفاتیح کے مطالعہ کے لئے ص ۳۴۷ جلد ۸ ملاحظہ فرمائیں)

کلونجی (منگریلا) میں موت کے سوا تمام امراض سے شفا ہے

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهُ قَالَ: اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ: "عَلَیْکُمْ بِهٰذِهِ الْحَبَّةِ السَّوْدَاءِ، فَاِنَّ فِیْهَا شِفَاءٌ مِنْ کُلِّ دَاءٍ اِلَّا السَّامُ وَالسَّامُ اَلْمَوْتُ۔"(۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے اوپر اس کالے دانہ کو لازم کرلو، اس میں موت کے علاوہ ہر بیماری سے شفا ہے۔ (سام بمعنی موت ہے)۔

اعتراض: اس روایت کو تنقید کا نشانہ اس لئے بنایا گیا کہ تجربات ومشاہدات کی روشنی میں یہ ایک مسلم امر ہے کہ مختلف امراض کے لئے الگ الگ دوائیں تجویز کی جاتی ہیں، بلکہ بسا اوقات ایک ہی مرض کے لئے بے شمار ادویات کا استعمال کیا جاتا

(۱) رواه البخاری، کتاب الطب باب الحبة السوداء، رقم الحديث:۵۶۸۷

والترمذی عن ابی هريرة، کتاب الطب، باب ماجاء فی الحبة السوداء، رقم الحديث:۲۰۴۱

ابن ماجة عن سالم بن عبد الله عن ابيه، باب الحبة السوداء، رقم الحديث:۳۴۴۷،۳۴۴۸

المسند الجامع لاحاديث الكتب الستة ومؤلفات اصحابها الاخرى موطا مالک، ومسانيد الحميدی، واحمد بن حنبل، وعبد بن حميد وسنن الدارمی، وصحيح ابن خزيمة، (الدكتور بشار عواد معروف)۔ عن ابی هريرة، ۱۷/۶۶۴۔ رقم الحديث، ۱۳۲۳۴۔مسند احمد: ۲/۵۲۔ ومسلم، کتاب الطب، باب الحبة السوداء۔ ورواه الحميدی: رقم الحديث : ۱۱۰۷

ہے، جیسا کہ ماہرینِ طب کا اتفاق بھی ہے کہ طبائع کے اختلاف، احوال کے اختلاف اور زمانہ کے اختلاف سے ایک ہی مرض کے لئے مختلف علاج ہوتے ہیں دوائیں جداگانہ ہوتی ہیں، ان حقائق کی روشنی میں پیغمبر دوعالم صلی اللہ علی وسلم کا یہ فرمان ''حبۃ السوداء میں موت کے سوا ہر بیماری سے شفا ہے'' کتنا مضحکہ خیز اور کتنا غلو آمیز معلوم ہوتا ہے؟

اس سوال کا جواب کئی شراح حدیث نے دیا ہے، جن میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ، علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ، ملا علی قاری رحمہ اللہ، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ، مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان جوابات کا خلاصہ ہم ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''زادالمعاد'' کے حوالہ سے مختصراً نقل کرتے ہیں پھر اس کے بعد جدید سائنسی تحقیقات ذکر کی جائیں گی۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ حربی ؒ نے امام حسنؓ کے سند سے کلونجی کو خردل قرار دیا ہے، خردل کو ہمارے دیار میں السی کہتے ہیں جو کہ بالکل مختلف چیز ہے۔

''کلونجی'' کے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ابن قیم نے بیان فرمایا کہ کلونجی نفخ کو دور کرتی ہے، پیٹ سے کیڑے نکالتی ہے، بخار اتارتی ہے، بلغم نکالتی ہے۔ معدہ اور لبلبہ کی رطوبتوں کو اعتدال پر لاتی ہے، اگر اسے پیس کر گرم پانی سے شہد کے شربت کے ساتھ پیا جائے تو گردوں اور مثانہ سے پتھری نکال دیتی ہے، اس کے اضافی فوائد میں دودھ، حیض اور پیشاب کو کھول کر لانا بھی ہے، زکام میں اس کا سونگھنا اور پینا مفید ہے، اس کے بیج پیس کر دودھ میں ملا کر پینے سے یرقان میں فائدہ ہوتا ہے، اس کو مسلسل کھانے سے لقوہ اور فالج دور ہو جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اسے ٹھنڈے پانی کے ساتھ پیس کر پینے سے باؤلہ پن ختم

ہوجاتا ہے، نیز اسی کو پینے سے بواسیر ختم ہوجاتی ہے، اور جانوروں کے کاٹنے کا زہر خاص طور پر زائل ہوجاتا ہے، بعض حضرات نے اسے سانپ کے زہر کے لئے بھی تریاق قرار دیا ہے..... کلونجی کو سرکہ میں پکا کر اس کی کلی کرنے سے مسوڑھوں کی سوزش اور دانتوں کا درد جاتا رہتا ہے، اسے آنکھوں میں پیس کر ڈالنے سے موتیا بین اگر ابتدائی حالت میں ہے تو وہ ٹھیک ہوجاتا ہے، سرکہ اور کلونجی کا مرکب جلدی امراض ایگزیما وغیرہ میں بے حد مفید ہے، زیتون کے تیل میں کلونجی کو ابال کر چھان کر اس تیل کے چند قطرے کان میں ڈالنے سے اس کی سوزش ٹھیک ہوجاتی ہے، اسی معجون مرکب کو ناک میں ڈالنے سے پرانا زکام ٹھیک ہوجاتا ہے۔ (۱)

زخموں پر چھلکے آتے ہوں تو چند روز کلونجی اور تیل لگائیں پھر کلونجی اور سرکہ لگانے سے جسم کے کسی بھی حصہ کے پھوڑے پھنسیاں ٹھیک ہوجاتے ہیں، جلد کے داغ جاتے رہتے ہیں اور برص میں بھی فائدہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ فتح الباری کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ (۲)

''طبِّ نبوی اور جدید سائنس'' میں ڈاکٹر خالد غزنوی نے علامہ ذہبی رحمہ اللہ کے قول کو نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

> کلونجی جسم کے کسی بھی حصہ کے سدہ کو دور کرتی ہے، اس کا تیل گنج پر لگائیں تو بال اُگتے ہیں، اور جلد سفید نہیں ہوتے، نصف چمچہ سفوف پانی کے ساتھ دمہ میں مفید ہے، کثرت استعمال زہروں کا تریاق ہے، زیابطیس، پتھری میں مفید ہے''۔ (۳)

---

(۱) زاد المعاد لابن قیم ۴/ ۲۹۸-۲۹۹، تفصیل کے لئے دیکھئے: زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ۴/ ۲۹۸-۲۹۹

(۲) فتح الباری ۱۰/ ۱۷۸۔ کتاب الطب، باب الحبۃ السوداء، رقم الحدیث: ۵۶۶۷

(۳) طب نبوی اور جدید سائنس ص ۲۲۸، اسلام اور میڈیکل سائنس

اس کے علاوہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے متقدمین ماہرین طب کے مشاہدات کو بھی بیان کیا ہے۔ ماہرین طب کے اعتقاد کے مطابق کلونجی کے بے شمار فوائد ہیں، قدیم اطباء وماہرین کلونجی کو بے شمار بیماریوں میں استعمال کرتے تھے، مثلاً سرد کھانسی، دردسینہ، استسقاء اور ریاحی قولنج، ان سب کے علاج میں ان کا مشاہدہ تھا کہ ''کلونجی'' بے حد مفید ہے، پیٹ کے کیڑوں کو خارج کرنے میں کلونجی مفید ہے، اگر قے میں پیپ آتی ہو، متلی کے ساتھ نالی میں ورم ہو اور سانس میں تکلیف ہوتی ہو تو کلونجی سے بہت جلد فائدہ ہوتا ہے، نیز ''کلونجی'' کو پانی میں پکا کر شہد سے ملا کر پینے سے مثانہ کی پتھری نکل جاتی ہے، اسے نہار منہ زیتون کے تیل کے ساتھ کھایا جائے تو چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے، اسے گرم کر کے سونگھنے سے زکام ختم ہو جاتا ہے۔

''کلونجی'' کے استعمال سے کھٹی ڈکاریں (جو عام طور پر زیادہ کھانے کی وجہ سے یا کھانا ہضم نہ ہونے کی وجہ سے آتی ہیں) بند ہو جاتی ہیں، اسے سرکہ میں بھگو کر خشک کر کے پیسنے کے بعد روزانہ سات گرام کھانے سے (کھانا کھانے سے پہلے) باؤلے کتے کے زہر کا اثر بالکل ختم ہو جاتا ہے۔[1]

ویدک طب میں بھی ''کلونجی'' مقبول ہے، ان کے مشاہدات میں یہ پیٹ اور معدہ کے بادی درد کو دور کرتی ہے، بدہضمی اور ہضم کا علاج ہے، عورتوں کا دودھ بڑھاتی ہے، پھوڑوں کا علاج ہے، (چونکہ یہ اسقاط حمل کرتا ہے، اس لئے حاملہ عورتوں کو نہیں دینی چاہئے) اس کا تین ماشہ سفوف مکھن میں ملا کر چٹانے سے ہچکی بند ہو جاتی ہے، پیشاب کی رکاوٹ کو دور کرتی ہے

سرکہ اور صنوبر کی لکڑی کے برادہ کے ساتھ ''کلونجی'' کو ابال کر دانتوں پر لگانے

---

(۱) خلاصہ بحث زاد المعاد ۴ / ۲۹۸-۲۹۹-۳۰

سے دانتوں کا درد ختم ہو جاتا ہے، ''کلونجی'' اور ''حب الرشاد'' کو ملا کہ سرکہ میں ابال کر گنج میں لگانے سے بال اگ جاتے ہیں، اس کے دھوئیں سے زہریلے کیڑے بھاگ جاتے ہیں، اسے گرم کپڑوں میں رکھیں تو انہیں کیڑا نہیں لگتا۔ (۱)

اس کے علاوہ ھدی اسلامی ڈائری میں کلونجی پر کیئے گئے تجربات میں سے ایک قدیم تجربہ یہ لکھا ہے کہ:

کلونجی، باپچی (تک ملنگا)، گوگل، دار ہلدی کی جڑ، گندھک میں سے ہر ایک کا پانچ تولہ ناریل کی دو بوتل تیل میں پیس کر ڈال دیں، یہ بوتل سات دن تک دھوپ میں پڑی رہے، کبھی کبھی ہلاتے رہیں، پھر چھان کر تیل علیحدہ کرلیں، اس تیل کو لگانے سے اکثر جلدی بیماریاں اور برص ٹھیک ہو جاتے ہیں، پانی میں ''کلونجی'' ملا کر لیپ کرنے سے چھیپ جاتی رہتی ہے''۔ (۲)

ماہیت: ''کلونجی'' پیاز کے بیج کے مشابہ، بو تیز، مزہ تلخ، پودا جھاڑیوں کے مانند آدھا میٹر، نیلے پھول، اس کے بیج تکونے، صاحب مخزن نے لکھا ہے کہ کلونجی کا ہندی نام ''حب السودا'' عربی نام کی وجہ تسمیہ کالا دانہ لکھا ہے، جو درست نہیں ہے، (کیونکہ کالا دانا ہندی النسل ہے) جو مسہل ہے، اس کے بیج تکونے، خوشبو میں تیز، ذائقہ میں تیز، کاغز پر نیل کے دھبے لگ جاتے ہیں۔ مزاج: گرم وخشک، مقام پیدائش، روم، ہندوستان۔ (۳)

---

(۱) زاد المعاد ۴/ ۲۹۹۔ نیز، سنت نبوی اور سائنس، روزنامہ ہمارا ''دکن'' ۲۴ دسمبر ۱۹۹۲ء بحوالہ اسلام اور میڈیکل سائنس۔

(۲) ھدی اسلامی ڈائری ص ۱۱۰/ ۱۹۸۹ء، توعیہ (نئی دہلی) ص ۱۳۱ بحوالہ اسلام اور میڈیکل سائنس۔

(۳) یونانی مفردات نئی دہلی ص ۲۲۹۔ (۴) فارما کوریڈیکا Farma coredik ص ۱۸۳

اور جہاں تک بات رہی کلونجی کے فوائد کی تو گذشتہ سطور میں ''زاد المعاد'' کے حوالے سے اس کے بہت سے فوائد ذکر کیے گئے ہیں، نیز قدیم اطباء کے مشاہدات کی روشنی میں بھی بے شمار فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، آئندہ جدید مشاہدات کا ذکر ہوگا، ان شاء اللہ ماہیت کے ذیل میں یہ بات بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگی کہ کلونجی کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں (حبۃ السوداء، عربی) سیاہ دانہ، کالا زیرہ، شونیز، کالا دانہ ہندی، کلونجی، ۔تلد جیرات (تلگلو) انگلش میں(Nigella sativa)۔[1]

کلونجی اور جدید سائنسی تحقیقات

اطباء نے ابتدا ہی سے ''کلونجی'' کو امراض البطن میں بڑے اہتمام سے استعمال کیا ہے، کیونکہ وہ اسے زیرہ کی قسم سمجھتے ہیں۔

جالینوس کو پیٹ کی بیماریوں کے علاج میں بڑا دعویٰ تھا، اس باب میں ان کا زیادہ تر نسخہ ''کلونجی'' کو شہد میں ملا کر دینا تھا، بعض دوسرے طبیبوں کا کہنا ہے کہ کلونجی شہد کا معجون یہ ایک ایسی ترکیب ہے کہ اسے پھوڑے، پھنسیوں اور اعصابی تکالیف کے علاوہ سانس کی گھٹن، جگر کی خرابی میں بھی بڑے اعتماد کے ساتھ دیا جاسکتا ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلونجی کو موت کے سوا ہر بیماری میں شفا قرار دیا ہے، اس اصول کے پیشِ نظر ذیابطیس کے مریضوں کو تین حصہ کلونجی اور ایک حصہ کاسنی (کاسنی زمانہ قدیم سے غذا اور دوا کے طور پر مقبول چلی آرہی ہے، یورپ میں زیادہ خودرو ہوتی ہے، وہاں پر جنگلوں میں اگنے والی کاسنی کو امراض تنفس کے علاج میں بڑی مقبولیت حاصل ہے، عربی میں اسے بندیا، بزر اللہ کے نام سے یاد کرتے

(۲) اسلام اور میڈیکل سائنس، طبِ نبوی جوزی ۲/۸،۲۷۷،۲۲۶۷۱

ہیں) کے بیج ملا کر ناشتہ کے بعد ایک چھوٹا چمچہ دیا جائے تو ایک ہی ہفتہ میں خون میں گلوکوس کی مقدار کم ہوجائے گی، پیشاب میں شکر ختم ہوجائے گی، یہ صرف مفروضہ نہیں بلکہ اب تک نو سے زیادہ مریضوں پر کامیاب تجربہ کیا جاچکا ہے، ویسے ذیابطیس کے لئے اسے مکمل شفا قرار دینا قبل از وقت ہے، بقول بعض ماہرینِ طب یونانی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

کلونجی کے بیجوں کو دودھ اتارنے، حیض کا خون بڑھانے اور پیشاب لانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

یورپ میں درد سے حیض آنے کے لئے کلونجی مشہور دواء ہے، زیادہ مقدار میں دینے سے اسقاط حمل کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ نیز پیٹ سے ہوا نکالنے اور بدہضمی کو دور کرنے میں مفید ہے، ''کلونجی'' کے ساتھ قسط شیریں میں ملا کر ناشتہ اور رات کے کھانے کے بعد دیں تو پرانی پیچش کے علاوہ دمہ میں بھی کافی سودمند ہے۔

بعض ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دمہ کے وہ مریض جن پر دیگر ادویہ کا اثر نہ ہورہا ہو۔ ان کو کلونجی کی آمیزش سے افاقہ ہوگا۔

''قسط شریں'' جنسی کمزوریوں کے لئے اچھی دوا ہے، مگر بسا اوقات اس کا تنہا اثر اتنا مفید نہیں ہوتا، ایسی صورت میں ''قسط شیریں'' کے ساتھ ''حب الرشاد'' اور ''کلونجی'' کو جب شامل کیا گیا تو فائدہ جلد ہوگیا۔

''کلونجی'' اور ''حب الرشاد'' کو ہم وزن ملا کر توے پر جلا کر اسے سرکہ میں گھول کر مرہم بنائی گئی، یہ مرہم ''برص'' کے داغوں پر لگانے سے داغ تین سے چار ماہ میں ٹھیک ہوگئے، لیکن یاد رہے کہ اس کے ساتھ اسی نسخہ کو توے پر بھونے بغیر خالص صورت میں شہد کے شربت کے ساتھ مریض کو ایک چمچہ روزانہ کھلایا گیا تو اس سے

برص کی بیماری ٹھیک ہوگئی حالانکہ برص وہ بیماری ہے جس کا عام حالت میں کوئی علاج نہیں ہے، نیز سر پر بال اگانے بلکہ گنج پر بال لانے کے لئے کلونجی اور مہند کو سرکہ میں گھول کر اگر سر پر تیسرے دن ایک گھنٹہ کے لئے لگایا جائے تو مفید ہے۔ (۱)

بھارتی ماہرین نے بھی اسے متعدد بیماریوں کے شفاء کے لئے دوا قرار دیا، چنانچہ بعض ماہرینِ طب (ہندی) نے کلونجی کو نفخ، درد شکم، قولنج، استسقاء، ضعف، اعصاب، ضعف دماغ، نسیان اور فالج میں کافی کارآمد بتلایا ہے۔ (۲)

غرض یہ کہ کلونجی کے بے شمار فوائد ہیں، مختلف استعمالات ہیں تحقیقات کی کمی نہیں، تجربات و مشاہدات کی کثرت ہے لیکن طوالت کا خوف ہے۔

بہرحال آج جدید تحقیقات و جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پیغمبر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہا وہ حقیقت پر مبنی ہے آپ کا پاک ارشاد غلو سے بالکل پاک ہے۔

---

(۱) مخزن الادویہ ص ۹۷، خواص الادویہ ص ۲۹۷ بحوالہ اسلام اور میڈیکل سائنس، وطب نبوی اور سائنس۔

(۲) ہندی اسلامی ڈائجسٹ نومبر ۱۹۸۹ء ص ۱۱۱

سنا میں تمام بیماریوں سے شفا ہے

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاَلَهَا بِمَا تَسْتَمْشِيْ؟ قَالَتْ: بِالشُّبْرُمِ، قَالَ حَارٌّ حَارٌّ! قَالَتْ: ثُمَّ اسْتَمْشَيْتُ بِالسَّنَا، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ شَيْئًا كَانَ فِيْهِ شِفَاءٌ مِنَ الْمَوْتِ لَكَانَ فِي السَّنَاءِ"۔(۱)

ترجمہ: حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ان سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ میں کونسا مسہل استعمال کرتی ہوں؟ میں نے کہا شبرم، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شبرم تو بہت گرم ہے، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ پھر میں سنا کا استعمال کرنے لگی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی چیز موت سے شفا دے سکتی ہے تو وہ سنا ہے"۔

اعتراض: "مستشرقین ومنکرین نے اس روایت کو اپنے ہدف کا نشانہ اس لئے

(۱) رواہ الترمذی ابواب الطب، باب ماجاء فی السنا، رقم الحدیث: ۲۰۸۱

وابن ماجة عن ابی عبد اللّٰه بن ام حرام وکان قد صلی مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم القبلتین، بلفظ "علیکم بالسنا والسنوت فان فیها شفاء من کل داء الا السام ابواب الطب، باب السنا والسنوت، رقم (۳۴۵۷)۔

مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (للحافظ نورالدین علی ابن ابی بکر الهیثمی) عن ام سلمة رضی اللّٰه عنها کتاب الطب، باب فی السناء والسنوت، رقم الحدیث: ۹۰۳۸

رواہ الطبرانی الکبیر ۸۹۲/۳۲ ابن حبان فی الثقات ۲۱۳/۶

بنایا کہ (بظاہر) اس روایت میں بھی غلو ہے کیونکہ ''سنا'' کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہر بیماری کے لئے شفا قرار دیا، جبکہ یہ تجربات ومشاہدات کے خلاف ہے۔

جواب: جواب سے پہلے حدیث کے چند الفاظ کی تحقیق کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ابن ماجہ کی روایت میں ہے " اَلسَّنَا وَالسَّنُّوْتُ فَهُمَا شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ"۔ ''سنا'' میں دو لغت ہیں، مد کے ساتھ، قصر کے ساتھ، قصر کے ساتھ سنا کو انگریزی میں Augstifolia Cassia کہتے ہیں، سنا ایک خودرو جھاڑی ہے جس کی لمبائی عموماً ۱۰۵ میٹر ہے، حجاز مقدس میں پہاڑوں پر پیدا ہوتی ہے، اس کے پتے دندانوں والے ہوتے ہیں۔ ''زاد المعاد فی ھدی خیر العباد'' میں ابن قیم رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

وَاَمَّا السَّنَاءُ فَفِيْهِ لُغَتَانِ: اَلْمَدُّ وَالْقَصْرُ، وَهُوَ نَبْتٌ حِجَازِيٌّ، اَفْضَلُهُ الْمَكِّيُّ"

سنا کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں پر چرنے والی بکریاں سنا کے پتے کو شوق ورغبت سے چباتی ہیں یہی وجہ ہے کہ حجازی بکروں کا گوشت مسہل ہوتا ہے، لیکن تحقیق کی روشنی میں یہ بات (کہ حجازی بکروں کا گوشت مسہل ہوتا ہے) صحیح معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ حجاز کے بڑے بڑے شہروں میں بلکہ ہر جگہ گوشت کھایا جاتا ہے لیکن کسی کو اسہال کی شکایت نہیں ہوتی۔

سنا کی کاشت مختلف ممالک میں ہوتی ہے، اب ہندوستان میں بھی اس کی کاشت ہونے لگی ہے لیکن حجاز مقدس کی ''سنا'' کا پودا اپنی شکل اور فوائد میں سنا کی دیگر اقسام سے بالکل ممتاز ہے۔

سنا کی حقیقت بیان کرنے کے سلسلے میں لوگوں کو ایک اور غلط فہمی ہوئی ہے، وہ

اس طرح کہ توریت کی ایک آیت ہے:

خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا، اس سے نگاہ کی اور کیا دیکھتا ہے کہ ایک جھاڑی میں آگ لگی ہوئی ہے پر وہ جھاڑی بھسم نہیں ہوئی۔ (۱)

اس آیت میں کوہ طور پر ایک جھاڑی کا ذکر آیا، لوگوں نے اسی جھاڑی کو ''سنا'' کی جھاڑی قرار دیا ہے، حالانکہ دلائل کی روشنی میں یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ والتین میں ''طور سینا'' کی خاص پیداوار ''زیتون'' کو قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی محققین نے ''سنا کے اصلی وطن کے بارے میں یہ بات یقینی طور پر کہی ہے کہ اس کا وطن مکہ معظّمہ اور اطراف ہیں ۸۵۰ء ۹۰۰ء کے درمیان ایک عرب سنا کا پودا مصر لایا، جس کی وہاں کاشت ہوئی، مصر کی زمین نے اس پودے کو قبول کرلیا، اور اب دریائے نیل کے پودے ڈیلٹا میں، سوڈان، اسوان وغیرہ میں سنا کی باقاعدہ زراعت ہوتی ہے، ایسے ہی اب ہند میں بھی اس کی کاشت ہوتی ہے۔

علم طب میں سنا کا استعمال دسویں صدی عیسوی سے پہلے کتابوں میں نہیں ملتا، اور یہ بات طے ہے کہ سنا کو بطور دواء کے عرب اطباء نے دسویں صدی سے شروع کیا اور اس کی کاشت کی طرف توجہ دی، ملک ہندوستان میں اس کی کاشت کے لئے میسور، ترچناپلی اور پانڈیچری بہت مشہور ہے۔ (۲)

---

(۱) دیکھئے توریت مقدس باب خروج ۲:۳

(۲) Mettery Medaam، یونانی ادویہ مفردہ دہلی ص ۱۸۶

تحقیق السنوت

سنوت کی تحقیق کے سلسلے میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف ''زادالمعاد فی ھدی خیر العباد'' میں آٹھ اقوال نقل کیے ہیں:

۱ ۔ یہ شہد ہے۔

۲ ۔ یہ گھی کے مشکیزے کا جوہر ہے جو گھی کے اوپر سیاہی مائل آجاتا ہے۔

۳ ۔ یہ زیرہ (کمیون) کی طرح ایک چیز ہے، یہ ابن الاعرابی کا قول ہے۔

۴ ۔ یہ کرمانی زیرہ ہے۔

۵ ۔ علامہ ابوحنیفہ دینوری نے اسے راز پانچ قرار دیا ہے، جسے محدثین نے سونف قرار دیا ہے۔

۶ ۔ چھٹا قول یہ ہے کہ یہ ''شُبت'' ہے، جس کو سویہ سے تعبیر کرتے ہیں یا سویا کا ساگ۔

۷ ۔ حافظ ابوبکر بن سنی نے اس کو کھجور کہا ہے۔

۸ ۔ حافظ عبداللطیف بغدادی رحمہ اللہ نے اس کو ایسا شہد قرار دیا ہے جو گھی میں رکھا ہوا ہو، کیونکہ شہد اور گھی دونوں اس کے مضر اثرات کو ختم کر سکتے ہیں۔ (۱)

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے آخری رائے کو زیادہ قرین قیاس قرار دیا ہے، نیز بعض اطباء نے بھی آخری رائے سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، کیونکہ خالص سنا کے استعمال سے پیٹ میں ہلکی سی سوزش ہو سکتی ہے، اس لئے اس کے ساتھ کسی ایسی چیز کا شامل ہونا ضروری ہے جو پیٹ سے ہوا نکال سکے اور قولنج کو رفع کر سکے، جیسے کہ

(۱) زادالمعاد فی ھدی خیر العباد ۴/ ۷۵۔ ۷۶

سونف، سویا، زیرہ، کھجوران میں سے ہر ایک کی صلاحیت یہی ہے، گھی آنتوں کو نرم کرتا ہے، اس لئے مذکورہ آٹھ میں سے کوئی بھی چیز سنا کے ساتھ مصلح بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

سنا کے سلسلے میں محدثین کے مشاہدات و تجربات

جیسا کہ یہ بات ''روایۃ الباب'' سے معلوم ہوگئی کہ حجاز مقدس میں مسہل کے لئے شبرم کا استعمال ہوتا تھا، لیکن چونکہ شبرم کے استعمال سے آنتوں میں سوزش ہونے کے ساتھ ساتھ خون بھی آنے لگتا تھا، اسی کی وجہ سے جلد پر دانے نمودار ہوجاتے تھے، اس لئے ماہر اطباء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اور اس کے بعد شبرم کے استعمال کو انسان کے لئے خطرناک اور مضر دواء قرار دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (طب کے باب میں) اپنی وہبی قوت وصلاحیت کی بنیاد پر شبرم کے مضر اثرات کو بھانپ کر سنا کے استعمال کی ترغیب دلائی، حدیث میں ''حار'' کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے، اس کے متعلق محدث ابوعبید کہتے ہیں کہ یہ حارّ وہ حارّ ہے جس کے معنی تو شدت کے ہی ہیں مگر اس میں شدت کا اظہار زیادہ ہوتا ہے۔

سنا حجاز مقدس کی ایک خودرو نباتات میں سے ہے جس کی عمدہ ترین قسم مکہ میں پائی جاتی ہے، سنا کے فوائد میں سے یہ ہے کہ یہ پیٹ سے صفراء خارج کرتی ہے، سوداء کو نکالتی اور دل کے پردوں کو تقویت دیتی ہے، پٹھوں اور عضلات سے اینٹھن کو دور کرتی ہے، بالوں کو گرنے سے روکتی ہے اور صحت مند بناتی ہے، جسمانی دردوں کو مٹاتی ہے، اس کے استعمال کی بہترین صورت اس کا جوشاندہ ہے، اس جوشاندہ کو پکاتے وقت اگر بنفشہ اور منقیٰ بھی شامل کرلیں تو بڑا مفید ہوگا، اس کے جوشاندہ کا پانچ

ماشہ ایک معقول مقدار ہے، زادالمعاد میں ہے:

وَاَمَّا السَّنَاءُ۔۔۔وَهُوَ نَبَتٌ حِجَازِيٌّ، اَفضَلُهُ الْمَكِّيُّ، وَهُوَ دَوَاءٌ شَرِيْفٌ مَامُوْنُ الْغَائِلَةِ، قَرِيْبٌ مِنَ الِاعْتِدَالِ، حَارٌّ يَابِسٌ فِي الدَّرَجَةِ الأُوْلٰى، يَسْهَلُ الصَّفْرَاءَ وَالسَّوْدَاءَ،وَيُقَوِّى جِرْمَ الْقَلْبِ،وَهٰذِهٖ فَضِيْلَةٌ شَرِيْفَةٌ فِيْهِ وَخَاصِيَّتُهُ النَّفْعُ مِنَ الْوَسْوَاسِ السَّوْدَاوِيِّ، وَمِنَ الشِّقَاقِ الْعَارِضِ فِيْ الْبَدَنِ وَيَفْتَحُ الْعَضَلَ وَيَمْنَعُ مِنْ اِنْتِشَارِ الشَّعْرِ"۔(۱)

علامہ ذہبی کی تحقیق کے مطابق سنا ان ادویہ میں سے ہے جن کے فوائد بے شمار ہیں، علامہ ذہبی ہی کا بیان ہے کہ اطباء قدیم کو جہاں بھی کچھ پیچیدگی اور پریشانیاں سامنے آتیں انہوں نے وہاں پر سنا ہی کا استعمال کیا، ان کے اعتقاد کے مطابق افادیت کی وجہ یہ رہی ہے کہ اس کے استعمال سے جسم کے غلیظ مادے باہر نکل جاتے ہیں، اوراس طرح غلاظتوں کے اخراج سے جسم میں تندرستی کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔

ابن سینا نے امراضِ قلب میں کام آنے والی ادویہ میں سرفہرست اس کا شمار کیا ہے، یہ جوڑوں کے درد کو دور کرتی ہے دماغ سے وسوسوں کو نکالتی ہے، اسی وجہ سے بعض اطباء نے اسے مرگی میں بھی مفید قرار دیا ہے۔علامہ رازی کی رائے اس سے ملتی جلتی ہے۔ (۲)

---

(۱) زاد العباد فی هدی خیر العباد لا بن قیم الجوزیه ۷۵/۴۔فصل فی هدیه صلی الله علیه وسلم فی علاج یبس الطبع، واحتیاجه الی مایمشیه ویلینه۔

(۲) زاد المعاد ۷۵/۴

سنا کے فوائد اور قدیم اطباء کے تجربات

جیسا کہ اوپر بات آئی کہ سنا کی مختلف اقسام ہیں، نیز مختلف جگہ اب اس کی کاشت ہونے لگی ہے، لیکن ماہرین طب کا دعویٰ یہ ہے کہ مکہ معظّمہ میں جو سنا پیدا ہوتی ہے وہ سب سے بہترین ہے، جبکہ اس کے علاوہ سنا کی دیگر اقسام فوائد میں مکی سنا سے کافی کمتر ہیں، مکی سنا کے پتے سبز اور پھول زرد ہوتے ہیں، اس کی پھلی چپٹی کے بجائے گول ہوتی ہے، جب تیز ہوا چلتی ہے تو اس میں خشخاص کے مانند دانے نکل کر پھیل جاتے ہیں، انہی دانوں سے نئے پودے پیدا ہوتے ہیں۔

اطباء کا خیال ہے کہ سنا کو ادویہ مسہلہ میں اعلیٰ مقام حاصل ہے، یہ سوداوی، صفراوی اور بلغمی مادوں کو جسم سے نکالنے کا شاندار ملکہ رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اندر سے پھنسی بلغم نکل جاتی ہے، قلب کے جرم کو تقویت دیتی ہے، دماغ سے وساوس نکالتی ہے خون صاف کرتی ہے، اور پیٹ کے کیڑے ماردیتی ہے۔[1]

سنا اور جدید سائنسی تحقیقات

جدید سائنس نے قبض کو ختم کرنے کے لئے اب تک پانچ ہزار سے زائد دوائیں ایجاد کی ہیں جن کو اطباء استعمال کررہے ہیں، آج سے پچاس سال پہلے کی ادویہ کی فہرست بھی سینکڑوں میں تھی......مگر دور جدید کے اطباء اور ایسے ہی آج کے دوافروش کے پاس قبض کو ختم کرنے کی جو دوائیں زیادہ مقبول ہیں وہ کل تین قسم کی ہیں، جن میں سرفہرست ''سنا'' ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہزار سالوں پر محیط طویل مشاہدات کے بعد سنا وہ منفرد دوا ہے جس کی مقبولیت اور اہمیت آج بھی وہی ہے بلکہ زیادہ ہے

---

(۱) دیکھئے زاد المعاد ۴/۷۵۱/۷۶

جو ہزار سال پہلے تھی...... نیز سنا کی اسی افادیت کے پیش نظر برٹش فارما کوڈیکس (Brithis for Codics) نے اس کو سرکاری طور پر تسلیم کیا ہے۔

جدید اطباء کا خیال ہے کہ سنا جلد امراض کے لئے ایک لاجواب دوا ہے، اسے مہندی اور کلونجی کے ساتھ ملا کر اگر سرکہ میں گھول کر استعمال کیا جائے تو یہ پھپھوندی سے پیدا ہونے والی تمام بیماریوں میں لاجواب دوا ہے۔ ایسے ہی ہاضمہ کی خرابی کی وجہ سے جب آکسیٹ اور یوریٹ زیادہ مقدار میں پیدا ہو رہے ہوں تو ایسی صورت میں سنا کا استعمال ان کے اخراج کا باعث ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ سنا مکی کے مسلسل اور دوام کے ساتھ استعمال کرنے سے گردوں، پتہ اور مثانہ سے پتھری کو حل کر کے نکالنے میں کافی مشہور اور مجرب دوا ہے، اس کے علاوہ بے شمار فوائد ہیں جن کا جدید سائنس اور دور حاضر کے اطباء کو اقرار ہے، ان تحقیقات کی روشنی میں اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں رہتی ہے اور جہاں تک بات رہی کہ یہ موت کی دوا ہے؟

جواب: موت کی دواء نہیں ہے، حدیث کے لفظ پر توجہ دیں تو اعتراض ہی نہیں ہوگا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی چیز موت کے لئے دوا بنتی تو یہ سنا ہوتی مگر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو موت سے بچنے کے لئے بطور دوا کام دے، لہٰذا یہ بھی نہیں ہے۔ سنا کی مزید جدید تحقیقات کے لئے طب نبوی او اسلام اور میڈیکل سائنس دیکھیں۔ (۱)

نبوّت والی مقدس آنکھوں نے وہ سب کچھ اپنے کشف و وجدان اور مشاہدہ کی لیبارٹری laboratory میں اس وقت دیکھ لیا تھا جس کا اعتراف آج کے سائنسدان ڈیڑھ ہزار سال بعد سلیکون Silicon اور سیمی کنڈکٹر Semi conductor کے

---

(۱) زاد المعاد ۴/۶۷ مرقاۃ المفاتیح ۸/۳۴۷۔ طب نبوی از غزنوی، ص: ۱۷۲

وجود کو پہچان لینے کے بعد اپنے کمپیوٹر لیب میں کرتے نظر آتے ہیں۔

بعض لوگوں میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ سائنس کے علم اور اسلام کی تعلیمات میں کوئی مطابقت نہیں اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا گمان یہ بھی ہے کہ سائنسی علم حاصل کرنے کے بعد انسان گمراہ اور بے دین ہو جاتا ہے، حالانکہ اسلام اور سائنس ایک دوسرے کی ضد ہرگز نہیں بلکہ ان میں ایک معتدل و مضبوط رشتہ ہے، سائنس کے دائرہ کار کا علم صرف مادیت Materiaalism تک ہی محدود ہے، جبکہ اسلام کا دائرہ علم مادیت سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ روحانیت Spiritualism کے لامحدود و لافانی علوم و فنون سے بھی آراستہ و پیوستہ ہے اور اس کے علم کے خزانے تک ابھی سائنس کی رسائی باقی ہے، لہٰذا اسلام کا تعلیمی خزانہ سائنسی تعلیمات کے خزانے سے افضل و وسیع ہے، انسان سائنسی تعلیمات حاصل کر کے کائنات کے رموز و اسرار سے واقف ہونے کی سعی کرتا ہے، نظام کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، جس سے اس میں خداشناسی کا جوہر پیدا ہوتا ہے، اس طرح وہ خالق کائنات کا حامی اور حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کار پر عمل کرنے کو باعثِ فخر سمجھنے لگتا ہے، میری معلومات کی حد تک خالق کائنات کا انحراف کرنے والا سائنسدان آج تک نہیں گذرا، یہ اور بات ہے کہ اس نے کائنات کے پیدا کرنے والے کو کسی اور نام سے پکارا ہو، لیکن ہر سائنسی ذہن نے اس خوبصورت کائنات کے ایک خالق ہونے کا اقرار یقینی طور پر کیا ہے، اور یہ بھی عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کائنات کا نظام کسی زبردست قوت کے ذریعہ رواں دواں ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا علم ابھی نامکمل ہے، اور ہر ناقص شئی ''نیم حکیم خطرہ جان'' کے مانند ہوتی ہے، ہر وہ شخص جو خالق کائنات کی ذات اقدس سے منحرف ہے وہ سائنسی شعور سے ناواقف اور سائنٹفک ذہن سے محروم ہے۔

خالق ارض وسموات نے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر ہمیں طرح طرح کے علوم وفنون وآدابِ زندگی کے تمام پہلوؤں کو سیکھنے وسمجھنے کا بہترین موقع عنایت کیا ہے، اس طرح ہم نے سائنس کی بہت ساری تعلیمات کو رحمۃ للعلمین کے ارشادات کا ایک جز پایا، یہاں ہم ایک چھوٹے سے ارشاد پر غور کرتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی رکھنے کو سنت قرار دیا ہے۔ اس سنت کا اگر ہم تاریخی جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ خالق کائنات نے اب تک جتنے بھی انبیاء بھیجے سب نے ڈاڑھی رکھی، آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک ہر ایک نبی کی سنت ڈاڑھی رکھنا رہی ہے، اگر ہم سائنسدانوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر بڑے مفکر وسائنسداں نے ڈاڑھی رکھی ہے چاہے، وہ ارسطو ہو کہ سقراط، لقمان ہو کہ نیوٹن، نپولین ہو یا گلیلیو، کاپرنکس ہو یا واس کوڈی گاما، اروند گھوش ہو یا شکسپیئر، نوبل لاریٹ پروفیسر عبد السلام ہو یا رویندر ناتھ ٹیگور ہر ذہین سائنسداں وفلسفی نے ڈاڑھی رکھنے کا عمل اپنے لئے بہتر سمجھا۔

جس طرح آدم علیہ الصلوۃ والسلام سے لے کر خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تک سبھی انبیاء کرام نے ڈاڑھی رکھنا افضل قرار دیا، اسی طرح بیشتر سائنسدانوں کی نظر میں بھی شیونگ ایک انتہائی مضر فعل ہے، برلن یونیورسٹی کے ڈاکٹر مور (Dr.mor) نے شیونگ لیڈ اور شیونگ میں استعمال ہونے والے صابن پر برسوں تجربات کیے اور بتایا کہ شیو کا نشتر جلد کو رگڑتا رہتا ہے جس کی وجہ سے چہرے کی جلد بہت حساس ہوجاتی ہے، اور انواع واقسام کے امراض کو بآسانی قبول کرلیتی ہے، بلیڈ یا استرے سے جلد اکثر مجروح ہوتی ہے، اور اگر جلد پر کوئی خارش آجائے تو جراثیم کے داخلہ کا بہترین موقع فراہم کرتی ہے۔

چہرے پر معمولی پھنسیاں اکثر نکلتی رہتی ہیں، پھر امپیکو (Impeigo) کے علاوہ ایک اور مخصوص جلدی سوزش جسے حجام کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے یعنی سائیکوسس باربیک (Sycosis Barback) جیسی خطرناک جلدی بیماری لگ سکتی ہے، اس کے علاوہ بعض ایسے خطرناک چھوتی امراض چہرے پر اور پھر اس کے ذریعہ سارے جسم کو لپیٹ میں لے سکتے ہیں، مثلاً مہاسے، چہرے کی جلد کی خشکی، کیل اور چھائیاں، پھنسیاں، ایگزیما، الرجی وغیرہ، بعض لوگ ایسا سوچ سکتے ہیں کہ یہ بیماریاں نائی کی دکان کی بد احتیاطی کے نتائج ہیں اور اپنا شیونگ کا سامان گھر پر جراثیم سے پاک کر کے استعمال کریں تو وہ مندرجہ بالا امراض سے حتی کہ ایڈز جیسے جان لیوا خطرناک مرض سے جو کہ نائی کی دکان سے بھی پھیل سکتا ہے ان سب سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ شیونگ کے فعل سے جلد حساس ہو جاتی ہے اور چاہے جتنا بھی جراثیم سے پاک شیونگ سامان استعمال کریں اس سے مرض کو کچھ حد تک ہی دور رکھا جا سکتا ہے کیونکہ شعائیں دھوپ کا عنصر ہیں اور جب یہ شعائیں سورج سے نکل کر جسم کے اس حصہ پر پڑتی ہیں جہاں کی جلد بہت حساس ہے تو وہ بے حد نقصان پہنچاتی ہیں، جس کے نتیجہ میں جلد کی رنگ سیاہ ہو جاتی ہے، جلد کے روغنی غدود (oil glands) کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اور اس طرح کے مختلف امراض گھیر لیتے ہیں، شیونگ کا یہ عمل غدہ نخامہ (Cpiluilary glands) پر مضر اثرات ڈالتا ہے پھر اس گلینڈ (Gland) کے نقص کی وجہ سے اعصابی نظام اور جنسی نظام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، مشاہدات اور تجربات کی رو سے اکثر ایسے مریض دیکھے گئے ہیں کہ جب انہوں نے شیونگ کے فعل کو ترک کر دیا تو مذکورہ بالا امراض سے مکمل نجات پا گئے اور پھر وہ مرض کی شدت میں کمی محسوس کرنے لگے۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''وَاعْفُوْ اللُّحٰی'' ''تم ڈاڑھی رکھو'' بظاہر یہ ایک غیر سائنسی حکم لگتا ہے تاہم یہ ارشاد تجربات ومشاہدات اور تحقیقات کی روشنی میں غیر معمولی سائنسی فلسفہ وسائنٹفک فکر رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ بے شمار قدرتی ادویات ہیں جو محسن انسانیت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خداداد صلاحیت کی بنیاد پر تجویز فرمائی ہیں جن کا ایک ایک نسخہ متعدد امراض کے لئے مفید ہے، جس کا سائنسدانوں نے بھی اعتراف کیا ہے، اور یہ کیوں نہ ہو جبکہ خالق کائنات اللہ رب العزت نے خود ہی ان ادویات کی نشاندہی آپ کی زبان سے فرمادی ہے۔ لہٰذا انسان کو قدرتی ادویات اور قدرتی مدافعات کی طرف توجہ کرنی چاہئے کہ یہ آسان بھی ہے اور سستا بھی، جیسا کہ ہندوستان کے مشہور محقق نباتات ڈاکٹر کرنل چوپڑا نے بہت سی ادویات شہد، انجیر، سرکہ، کلونجی، سنا، اثمد سرمہ، وغیرہ پر سیر حاصل تحقیق کی اور اپنا نام کمایا، ان کا کہنا ہے کہ:

> میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جن ادویات پر تحقیق ہو چکی ہے ان پر نئے سرے سے تحقیق کی جائے تو پتہ چلے گا کہ God (اللہ تبارک وتعالیٰ) نے ان کے اندر ایک بحر بے کنار سمو رکھا ہے جو کہ مخلوق خدا کو فیض یاب کرنے کے لئے بے چین ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ جدید میڈیکل سائنس نے قدرتی ادویات وقدرتی قوت مدافعت Nalieral immnily چھوڑ کر مصنوعی مدافعت کے نظام پر ساری توانائیاں صرف کردیں جو کہ سراسر فطرت کے تقاضوں کے خلاف ہے، اور یہی وہ

راستہ ہے کہ جو جسم کو غلط راستہ کی طرف لے جاتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے ریسرچ اسکالر اس بات کو مانتے ہیں کہ اگر جسم کی مدافعتی قوت بیماری کے خلاف طاقتور ہو تو جسم بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے، یہ بات W.H.O ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے بھی تسلیم کی ہے کہ بیماری کے دوران بھی قوت مدافعت کو بہتر کیا جاسکتا ہے مگر ایلو پیتھک نے محض جراثیموں کی ایجاد کو حرف آخر سمجھا اور اپنی ریسرچ کا سارا زور اس بات پر دیا کہ کسی بھی طریقہ سے مرض کی علامت کو ختم کردیا جائے چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔

بحث کا حاصل یہ ہے کہ رب کریم نے انسان کے جسم کو حکمت و مہارت کے ساتھ تخلیق کیا ہے، اور جو مشینری اس میں فٹ کی ہے اس کے کام کرنے کے اصول بھی وضع کیے ہیں، اگر اس مشینری میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو اس کے تدارک کے لئے فطرت نے فطرتی وقدرتی علاج بھی ساتھ ساتھ پیدا فرمایا ہے، تو کیوں نہ اپنی ریسرچ و تحقیق کا رخ بجائے قانون خدا اور رسول کی مخالفت کرنے کے مطابقت میں کرلیا جائے، احقر کے خیال میں یہ دنیا کا سائنٹفک ترین علم ہوگا اور اسے قانون قدرت کے خلاف کہنے والے غلطی پر ہیں۔

اختتامیہ

یہ تفصیلات اور یہ تحقیقات آج کی جدید طبائع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کی گئی ہیں، چونکہ آج کل سائنس کا زمانہ ہے اس لیے عقل وفکر کے بعض بیماروں کا خیال یہ ہے کہ جس چیز کا اثبات سائنس کرے گی اسے تسلیم کریں گے اور سائنس سے جس چیز کا ثبوت نہیں ملے گا اس کا انکار کردیں گے، ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ سائنس اور مذہب کی حدود بالکل الگ الگ ہیں، غلط فہمی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک کو دوسرے میں داخل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ان کو اگر اپنی اپنی حدود میں رکھا جائے تو ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی نفی نہیں کرتا بلکہ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کم از کم مذہب اسلام سائنس کی نفی کے بجائے اس کا اثبات کرتا ہے، اسے اساسی اصول اور مبادیات مہیا کرتا ہے، آخر سائنس کی بنیاد کائناتی مشاہدہ پر ہی تو ہے اور اسلام نے کائنات میں غور وفکر کرنے پر تمام مذاہب سے زیادہ زور دیا ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَعِلْمُهٗ اَتَمُّ۔ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ۔

********************* ✺ *********************

تعدّد ازدواج

عقل ونقل کی نظر میں

حضرت مولانا مفتی نہال اختر قاسمی صاحب
فاضل دارالعلوم دیوبند، انڈیا

ادارۃ المعارف کراچی

چالیس بکھرے موتی

حضرت مولانا مفتی نہال اختر قاسمی صاحب
فاضل دار العلوم دیوبند، انڈیا

ادارۃ المعارف کراچی

مَعَارِفُ الانور رحمۃ اللہ علیہ

یعنی

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف

محترم محمد اقبال قریشی صاحب

مجاز بیعت

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴